جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مئی ۱۹۹۵

جلد 121

شمارہ 5

مُدیر: خرّم مُراد

اِدارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر : خرم مراد

جلد ۱۲۱ | مئی ۱۹۹۵ ذوالحجہ ۱۴۱۵ | عدد ۵

فہرست مضامین

ادارتی امور

منصورہ، ملتان روڈ لاہور ۵۴۵۷۰

فون ۴۴۱۲۰۷۵۷ - فیکس ۷۵۴۲۱۹۴

انتظامی امور

۵ - اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

فون ۷۵۸۵۵۹۰ - ۷۵۸۷۹۱۲

☆

قیمت فی شمارہ ۱۲/- روپے

زر سالانہ ۱۲۰/- روپے

مشرق وسطی ۳۵۰/- روپے

بنگلہ دیش ۳۰۰/- روپے

یورپ، مشرق بعید ۶۰۰/- روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ۷۰۰/-

بنک ڈرافٹ

بنام ماہنامہ ترجمان القرآن ارسال فرمائیں

۶۰ سال پہلے

اسلام میں فرقوں کی پیداوار کا اصلی سبب یہی ہے کہ کلام اللہ میں اصول و ضروریات دین کے متعلق جو مجمل اور بسیط تصورات پیش کیے گئے ہیں، اور کہیں کہیں ان کی تفصیل میں جو لطیف اشارات کر دیے گئے ہیں، ان کو سمجھنے میں مختلف لوگوں نے اپنی عقلی استعدادات اور طبعی رجحانات کی بنا پر قیاس و استدلال کے ذریعے سے جزئیات اخذ کر لیے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس حد تک تو کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس میں بھی کوئی خرابی نہ تھی کہ ایک گروہ صرف اپنے مسلک کو حق سمجھتا اور دوسرے گروہوں سے بحث کر کے ان کو اپنے مسلک کی طرف لانے کی کوشش کرتا۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے قیاسی و تاویلی عقائد کو بھی اصول و ضروریات دین میں شامل کر لیا، اور اس بنا پر ہر ایک جماعت نے ان تمام جماعتوں کی تکفیر کی جو ان عقائد کو نہ مانتی تھیں۔ یہیں سے حزب عقائد کی ابتدا ہوتی ہے اور یہی ظلم کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عقائد اسلام میں قیاسات و تاویلات سے جو راہیں اختیار کی گئی ہیں ان میں سے بہت سی راہیں غلط ہیں لیکن ہر غلطی حتماً اور لازماً کفر تو نہیں ہے۔ غلطی کو غلطی کہنا، اور اس کا ارتکاب کرنے والے کو گمراہ اور غلط کار سمجھنا اور اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرنا بلاشبہ جائز ہے۔ لیکن جب تک کوئی شخص اس نفس حقیقت کا انکار نہیں کرتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کا حکم دیا ہے، اس کو کافر بنانے کی طرح بھی جائز نہیں، خواہ اس کی گمراہی کتنی ہی بڑھی ہوئی ہو۔

افسوس ہے کہ متاخرین نے اصل اور فرع، نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول سمجھنے لگے ہیں جن کو انھوں نے اپنی مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو انھوں نے نصوص سے معانی اخذ کرنے میں اختیار کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کافر قرار دیتے ہیں جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔

اس بے اعتدالی نے پہلے تو اسلامی جمعیت میں صرف تفرقہ ہی پیدا کیا تھا مگر اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ علما کی یہ کافر گری مسلمانوں کے دلوں میں نہ صرف علما کی طرف سے بلکہ خود اس مذہب کی طرف سے بھی بدگمانیاں پیدا کر رہی ہے جس کی نمائندگی یہ علما کرتے ہیں۔ روز بروز علما کا اقتدار مسلمانوں پر سے اٹھتا جا رہا ہے۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی "اشارات" جلد ۶ عدد ۲ صفر ۱۳۵۲ مئی ۱۹۳۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

نئی صلیبی جنگ ' دینی مدارس کے دروازوں پر

خرم مراد

۲۳ جنوری کی صبح کے اخبارات میں چیختی ' چنگھاڑتی سرخیاں دینی مدارس کے خلاف محترمہ بے نظیر کی حکومت کی طرف سے اعلان جنگ کر رہی تھیں: "دینی مدارس کی چھان بین اور نصاب تبدیل کرنے کا فیصلہ ' وزراے اعلیٰ دو ہفتے کے اندر اقدامات کی رپورٹ پیش کریں گے ' وزیر اعظم کا صوبائی حکومتوں کو حکم" (جنگ ' کراچی) "براہ راست غیر ملکی امداد حاصل نہ کر سکیں گے ' دینی نصاب تعلیم یونیورسٹی سے منسلک کر دیا جائے گا" (نوائے وقت ' لاہور) "یکساں نصاب رائج کیا جائے گا" (جسارت ' کراچی) "حساب کتاب دینا ہو گا" (مساوات ' لاہور)۔ دہشت گردی اور فرقہ واریت کے خاتمے کے نام پر ' یہ فیصلے وزیر اعظم کی زیر صدارت ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں کیے گئے ' اور ساتھ ہی ان پر عمل در آمد کرانے کے لیے وزارت داخلہ میں ایک سیل بھی قائم کر دیا گیا۔

گذشتہ دو ماہ سے اخباری اطلاعات کے مطابق یہ مہم جاری تھی۔ وزارت داخلہ نے ہدایت جاری کی کہ اس کی پیشگی اجازت کے بغیر نہ کسی نئے دینی مدرسے کو رجسٹر کیا جائے ' نہ کسی پرانے مدرسے کی رجسٹریشن کی تجدید کی جائے۔ پولیس نے مدرسوں میں بچوں سے جبری بیگار لیے جانے کے الزام کی تحقیق شروع کر دی۔ وزیر اعظم نے اس اخباری رپورٹ پر انکوائری کی ہدایت دی کہ ایک مدرسے میں طلبہ کو زنجیروں سے باندھ کر قرآن کریم کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ادھر بین الاقوامی سطح پر ایمنسٹی انٹرنیشنل نے مدارس کے خلاف محاذ سنبھال لیا ہے۔ حکومتی اداروں کے تعاون سے ' چند غیر معیاری اور برائے نام دینی مدارس کے سروے کو بنیاد بنا کر ' وہ جون تک ایک رپورٹ منظر عام پر لا رہی ہے۔ اس میں دکھایا جائے گا کہ "پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو آج

کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے' انھیں مارا جاتا ہے' زنجیروں سے باندھا جاتا ہے' ان سے جبری بے گار لی جاتی ہے' ان کی خوراک' رہایش اور صفائی کا معیار ناقص ہے' انھیں مدارس میں آزادی رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں' انھیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ قومی زندگی کے کسی شعبہ میں کھپ نہ سکیں' ان کے نام پر چندہ اکٹھا کر کے مدارس کے منتظمین کھا پی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی خستگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں' اور ان مدارس میں طلبہ کو اسلحے کی ٹریننگ دے کر دہشت گرد بنایا جا رہا ہے"۔ (مولانا زاہد الراشدی' ماہنامہ الشریعہ گوجرانوالہ' جنوری ۹۵' ص ۳۴)

پاکستان کی حکومت نے یہ حملہ جس سوچی سمجھی تیاری کے ساتھ شروع کیا ہے اس کا اندازہ صرف ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ ادھر صوبائی حکومتوں کو کوائف جمع کرنے کا حکم ہوا' ادھر اگلے ہی دن (۲۴ جنوری) سے روزنامہ دی نیوز نے پنجاب کے مدارس کے کوائف اور ایک ایک مدرسے کو ملنے والی زکوٰۃ کی تفصیلات شائع کرنا شروع کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ معلومات حکومت ہی نے فوری طور پر بہم پہنچائیں' ورنہ نامہ نگار خود ۲۴ گھنٹے میں یہ کارنامہ انجام نہ دے سکتا تھا۔ ساتھ ہی یہ سرخی بھی جمائی گئی کہ "مدارس لوہے کے چنے ثابت ہوں گے جو وزیراعظم سے چبائے نہ چبیں گے"۔ اگلے دن "دستوری ماہرین" کی بے سروپا آرا شائع کی گئیں کہ بیرونی امداد لینا دستور کی خلاف ورزی ہے۔ (پتہ نہیں کس دفعہ کی!)' ملکی قانون کے خلاف ہے' یہ خارجہ پالیسی میں مداخلت ہے (کیا ایک عالم دین کے امورِ خارجہ کمیٹی کا صدر بن جانے کی وجہ سے!)' مدارس تعلیمی ادارے نہیں کیونکہ وزارت تعلیمات نے انھیں منظوری نہیں دی ہے۔ اور ٹیپ کا بند' حکومت کو مشورہ کی صورت میں حکومت کی اپنی دھمکی: "زکوٰۃ فنڈ سے ملنے والی رقوم تو چشم زدن میں صرف ایک انتظامی حکم کے ذریعہ بند کی جا سکتی ہیں!"

شاید اس پر تعجب ہو--- اگرچہ تعجب کی کوئی بات نہیں --- کہ اسی انداز میں' انھی الفاظ میں' انھی بنیادوں پر' ایسی ہی مہم' دینی مدارس کے خلاف بھارت میں چل رہی ہے۔ ۲۱ نومبر ۱۹۹۴ کو آدھی رات کے بعد دہلی سے بھیجے گئے کمانڈوز اور پولیس نے ندوۃ العلما لکھنؤ کی مشہور درس گاہ پر چھاپا مارا' طلبہ پر تشدد کیا اور انھیں گرفتار کیا۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ دارالعلوم دیوبند کے ساتھ بھی پیش آچکا تھا۔ صورت حال کی تصویر کشی کرتے ہوئے آل انڈیا ملی کونسل کے تحت ایک کل ہند دینی مدارس کنونشن کے سامنے اپنے کلیدی خطاب میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کہتے ہیں: عین اس وقت جب ہم اپنی زبوں حالی پر آنسو بہا رہے ہیں اور مدارس اسلامیہ کی کمزوریوں کا محاسبہ کر رہے ہیں' دشمنانِ اسلام

انھی مدارس کو اپنے لیے خطرے کا سب سے بڑا مرکز سمجھ رہے ہیں... قال اللہ وقال الرسول کے گونجنے والے نغموں میں [انھیں] اسلام کی حیات نو کا خطرہ 'بنیاد پرستی کی بو اور آئی ایس آئی کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ مدارس کو بدنام کرنے کے لیے انھیں کبھی اسمگلنگ کا اڈہ بتایا جاتا ہے اور کبھی ان کی جدید تعمیرات میں غیرملکی پیسے کا عمل دخل بتایا جاتا ہے... تہذیب اور لباس کی تبدیلی کو بڑی گہری نظر سے واچ کیا جا رہا ہے' اسے ایک بڑا خطرہ تصور کیا جا رہا ہے۔ مدارس کو آتنک وادیوں کا اڈہ اور ہتھیاروں کا بھنڈار تصور کیا جا رہا ہے... اصل خطرہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو ایسی تعلیم دی جا رہی ہے کہ بڑے ہو کر بنیاد پرست (فنڈا منٹلسٹ) اور عسکریت پسند بنیں گے' اور کسی کو یہ خوف ہے کہ جو طبقہ ان مدرسوں سے نکلے گا وہ اسلامی تشخص اور اپنی مذہبی شناخت کا سخت وکیل ہو گا" (ماہنامہ الفرقان 'لکھنؤ' نومبر۔ دسمبر ۹۴' ص ۱۴)۔

یہ خوف و خطرہ کچھ غلط بھی نہیں۔ مدرسوں سے جو نوجوان نکلیں گے وہ بالعموم اللہ اور اس کے رسول کی "بنیادوں" پر ایمان سے لبریز' اسلامی تشخص کے علم بردار' اور احیائے اسلام کے نشے سے سرشار ہوں گے' (اور یہی "بنیاد پرستی" ہے جو چبھتی ہے)' خواہ وہ فی الوقت اپنے مقصد کے لیے درکار کماحقہٗ' اہلیت سے تہی دامن ہوں۔ مدارس کے خلاف مغرب کی دشمنی کوئی نئی چیز بھی نہیں: فرانس نے الجیریا میں اور روس نے وسط ایشیا میں مدارس کو ختم کیا' ہالینڈ نے انڈونیشیا میں اور برطانیہ نے ہندو پاکستان میں ان کو ختم کرنے یا مفلس و قلاش اور بے اثر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اتاترک نے بھی' جب "مغربی" بننے کا فیصلہ کیا' خلافت ختم کر کے پہلا وار مدرسوں پر کیا' اور پھر عربی رسم الخط کو لاطینی سے بدل دیا' تاکہ دینی علوم سے رشتے کی کوئی سبیل ہی باقی نہ رہے۔

لیکن تاریخ کے اس مرحلے میں مغرب نے' اور مغرب کے باج گزار ان مسلمان حکمرانوں نے ---جو مغرب کے مقاصد پورے کرنے کے لیے اگلے مورچوں پر "دہشت گردی" (یعنی 'اسلامی احیا) کے خلاف جان لڑانے کی پیشکش کر چکے ہیں--- مدارس اور علما کے خلاف جس شد و مد سے اپنی جنگ کا آغاز کیا ہے' اس کے اسباب اس خوف و خطرے سے بہت زیادہ گہرے' دُور رَس اور بالکل بنیادی نوعیت کے (فنڈا منٹلسٹ) ہیں۔ ان کا تعلق مغرب اور اسلام کے درمیان اس تہذیبی کشمکش سے ہے جس کے لیے تاریخ کا میدان گرم ہو رہا ہے۔

رہے وہ الزامات بظاہر جن کی بنیاد پر مدارس کے خلاف مہم کو عام آدمی کی نگاہ میں جائز ٹھہرانے کی کوشش کی جا رہی ہے' تو ان کے لچر' بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہونے کا علم' ہم سے زیادہ خود الزام

لگانے والوں کو ہو گا۔

بے تحاشا تعداد ' کثیر مالی امداد ' اور اس کے غلط استعمال کا بہت ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس وقت پورے پنجاب میں صرف تقریباً ۲ ہزار ۵ سو مدارس ہیں' جن میں کل ۲ لاکھ ۱۹ ہزار طلبہ پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے ' ۱۷ سو' یعنی ۶۵ فی صد مدارس حکومت سے کوئی زکوٰۃ فنڈ نہیں لیتے۔ گذشتہ سال ' تقریباً ۸ سو مدارس کو ۷ کروڑ روپے دیے گئے ' یعنی او سطاً " فی مدرسہ ۸۷ ہزار روپے ' یا ۷ ہزار روپے ماہانہ۔ اتنی رقم تو ایک کالج کے ایک سینیر لیکچرر کی تنخواہ بھی بن جاتی ہے۔ لاہور ضلع میں گذشتہ سال ۸۶ مدارس کو ۵۲ لاکھ روپے دیے گئے ' یعنی او سطاً " ۵ ہزار روپے ماہانہ۔ ان میں سے بھی اگر وہ ۸ مدارس نکال دیے جائیں جن کو ایک لاکھ سے زائد رقم دی جارہی ہے ' تو بقیہ کا اوسط مشکل سے ۳ ہزار ماہانہ بنے گا۔ گذشتہ ۹ برسوں (۱۹۸۴ تا ۱۹۹۳) میں دیے ہوئے فنڈز کا اوسط بھی یہی ہے۔ یعنی اخراجات کئی گنا بڑھ جانے کے باوجود فنڈز میں ایک پائی نہیں بڑھی۔

بیرونی امداد بالعموم وہاں مقیم پاکستانی باشندوں سے ' کسی قدر مخیر حضرات اور اداروں سے ' اور شاذ و نادر کسی حکومت سے ملتی ہے۔ حکومت نے کھوج کرید کر کے اس پہاڑ سے کیا چوہا بر آمد کیا ہے؟ رحیم یار خان کے ۲۳ مدارس کو " مشرق وسطیٰ کے ایک والی ریاست " سے امداد ملی ہے۔ سوچیے کتنی؟ ۹۵ لاکھ روپے ' یعنی ۴ لاکھ روپے فی مدرسہ۔ رحیم یار خان کے حوالے سے یہ شخصیت شیخ زید کے علاوہ کس کی ہو سکتی ہے۔ کیا بھٹو خاندان پر ان کی فیاضی کی بارش کچھ کم ہوئی ہے کہ اس پر بھی اعتراض ہو۔ ایک فرقہ کے ۲۵ مدارس کو بیرونی " ملاؤں " نے امداد فراہم کی۔ کتنی؟ ایک ماہ میں ۳ لاکھ ۷۰ ہزار روپے یعنی ۱۵ ہزار روپے فی مدرسہ کی خطیر رقم۔ یہ حقیقت ہے بے تحاشا فنڈز دیے جانے کے الزام کی۔

مدارس کو بیرونی امداد ملے بھی تو اس پر اس حکومت کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے جو خود سرتاپا بیرونی امداد کی محتاج ہے ' جو اپنا بال بال بیرونی قرضوں اور سرمایہ کاری کے سنہرے جال میں باندھتی چلی جارہی ہے ' اور جس کی ناک کے نیچے سیکڑوں عیسائی مشنری ادارے ' اور این جی اوکھلے بندوں باہر سے لاکھوں کروڑوں ڈالر وصول کر رہے ہیں ' اور صرف فارن پالیسی میں نہیں بلکہ اندرونی پالیسیوں ' تہذیب ' ثقافت ' سیاست ' قانون ' عدالت ' مقدمات سب میں مداخلت کر رہے ہیں۔ کیا یہ خلاف دستور و قانون نہیں؟ اِلّا یہ کہ فارن پالیسی میں مداخلت سے مراد مغرب کی غلامی اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مداخلت ہو۔

مدارس کی مالیات کے بارے میں حکومت ایک مخمصے میں گرفتار ہے۔ ایک طرف وہ زکوٰۃ کی

معمولی رقوم اور بیرونی امداد پر شور مچا رہی ہے۔ دوسری طرف اسے اس بات کی بھی سخت تکلیف ہے کہ یہ مدارس چندوں سے کیوں چل رہے ہیں۔ دراصل تو وہ یہ چاہتی ہے کہ یہ مدارس ختم ہو جائیں یا پوری طرح اس کے کنٹرول میں آجائیں۔ یہ بات وہ کہہ نہیں سکتی۔ کنٹرول میں لینے کے لیے پیسہ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتی' اور خرچ بھی کرے تو یہ جانتی ہے کہ اکثر و بیشتر مدارس اس کی امداد کے عوض اپنی آزادی کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ مولانا قاسم نانوتوی ؒ نے جب دارالعلوم دیوبند کے لیے ۸ نکاتی دستور العمل تجویز کیا تو سرفہرست زیادہ سے زیادہ چندے کی فراہمی کو رکھا تاکہ مدارس عوام کے بل پر چلیں' حکومتوں کے محتاج نہ ہوں۔

مدارس کے خلاف اقدامات کا اصل جواز تو فرقہ واریت اور دہشت گردی' باہم خون ریزی' خصوصاً مساجد میں' اور اسلحے کے استعمال اور فوجی تربیت کے خلاف کارروائی کے نام پر فراہم کیا گیا ہے۔ کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے برعکس' دینی مدارس میں نہ جھگڑے ہوتے ہیں نہ اسلحے کا استعمال' نہ ایک فرقے کے مدارس دوسرے فرقے کے مدارس سے دست گریباں ہیں۔ فوجی تربیت کا اہتمام بھی شاید ہی کسی مدرسے میں ہو۔ لیکن دینی طالب علم فوجی تربیت کیوں حاصل نہیں کر سکتے۔ مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ "ہم اس بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے"۔ "فرقہ وارانہ جھگڑوں اور غیر قانونی اسلحے اور دہشت گردی کے ہم سخت خلاف ہیں۔ البتہ جہاد ایک دینی فریضہ ہے' جہاد کی تربیت کا اہتمام متعدد دینی مدارس میں کیا جاتا ہے' اور ان شاء اللہ یہ اہتمام جاری رہے گا" (البلاغ' فروری ۹۴' ص ۲۷)

فرقہ وارانہ دہشت گردی میں' مدارس نہیں' تنظیمیں ملوث ہیں۔ یہ دہشت گردی یقیناً مجموعی طور پر دینی طبقات کے دامن پر ایک سخت بدنما داغ ہے' ایک سنگین معاملہ ہے' لیکن اسے بڑھا چڑھا کر اچھالا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے فرقہ واریت کے نام پر جو خون ریزی ہو رہی ہے۔۔ یا کرائی جا رہی ہے تاکہ اہل دین پر ہاتھ ڈالنے کا جواز فراہم ہو۔۔ وہ ملک میں سیکولر سیاسی فرقہ واریت اور نسلی و لسانی تعصبات میں ہونے والی خون ریزی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کراچی میں ۱۹۹۵ء کے پہلے ۲۷ دنوں میں ۲۶۰ افراد ہلاک ہوئے' جن میں زیادہ سے زیادہ ۵۸ افراد کی موت کو فرقہ واریت کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے' جبکہ یہ وہ مدت ہے جس میں اس نوعیت کی اموات سب سے زیادہ ہوئیں۔

جہاں تک مدارس کے تعلیمی نظام میں اصلاح اور تغیر و تبدل کی ضرورت کا تعلق ہے' اس سے کسی کو انکار نہیں۔ یہ ایک عظیم چیلنج ہے۔ ممکن ہے اس چیلنج کی وسعت کا پورا ادراک مدارس کے ارباب حل و عقد میں عام نہ ہو' لیکن اس کی ضرورت کا احساس کسی نہ کسی درجہ میں ہر جگہ موجود

ہے۔نصاب کی اصلاح تو آج کے چیلنج کا ایک بہت محدود حصہ ہے۔لیکن نصاب کی اصلاح ہو یا دیگر اصلاحات، یہ مدارس کا اپنا کام ہے، وہی کریں گے تو کامیاب ہو گا۔حکومت کی طرف سے نصاب مسلط کرنے کا خواب کبھی پورا نہ ہو گا۔جس حکومت کا اپنا تعلیمی نظام زبوں حالی کا شکار ہے---جہاں پرائمری اسکولوں میں چھتیں اور فرنیچر نہیں، جہاں امتحانات ایک ایک سال موخر ہوتے ہوں اور نتائج چھ، چھ ماہ کے بعد آتے ہوں، جہاں ہر امتحان میں ساٹھ ستر فی صد طلبہ فیل ہوتے ہوں---وہ حکومت کس منہ سے مدارس کی اصلاح کا دعویٰ کر سکتی ہے۔

دیکھا جائے تو مدارس اور علما کا معاشرہ میں سیاسی، معاشرتی اور علمی و فکری اثر و رسوخ بہت محدود ہے۔انتخابات میں ان کی کارکردگی مایوس کن ہے۔حکومت کے مناصب ان کے پاس نہیں ہیں۔فوج اور بیوروکریسی میں ان کا داخلہ بند ہے۔عدلیہ میں گنتی کے چند افراد ہیں، لیکن سیکنڈ کلاس ججوں کی حیثیت میں۔فرقہ وارانہ کشیدگی نے ان کا وقار اور مقام مزید گرا دیا ہے۔بہت سے علاقوں میں مسجد کے امام کا مقام نیچے درجے کے کام کرنے والے کمی سے مختلف نہیں۔

پھر آخر ان مدارس سے مغرب اور مغرب کے مسلمان مہرے کیوں اتنا خائف ہیں؟ میڈیا، خصوصاً انگریزی میڈیا، ان کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑا ہے؟ مغرب کی شہ پر، اور ازخود بھی، پاکستان کی حکومت ان کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں کیوں اتر رہی ہے۔

اس اہم سوال کا حقیقت پر مبنی جواب مشہور برطانوی ہفت روزہ اکنامسٹ نے اپنی ۶ اگست ۱۹۹۴ کی اشاعت میں فراہم کیا ہے۔یہی وہ جواب ہے جو اس مسئلے کے بنیادی اور دُور رَس پہلوؤں کے چہرے سے نقاب اٹھا دیتا ہے۔

"اسلام کا سروے" نام کے طویل مضمون کا خلاصہ یوں ہے:

۱۔دنیا کی قیادت کی حقیقی دعوے دار دو ہی تہذیبیں ہیں: مغرب اور اسلام۔

۲۔اسلام ایک آئیڈیا ہے: آج کی دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد آئیڈیا، شاید اس نوعیت کا آخری آئیڈیا جو دنیا دیکھے [یاکم سے کم اسے آخری بنانا مغرب کا مشن ہونا چاہیے!]، آئیڈیا جو انسانی تجربے و مشاہدے سے ماوراحق پر یقین کا مدعی ہے۔یہ "الحق" اللہ کا کلام ہے، جس کا لفظ لفظ، ۱۴۰۰ سال پہلے، عرب کے ایک گرد آلود کونے میں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا، اور انھوں نے اسے قرآن میں نقل کر دیا۔یہ آئیڈیا انسان کی باطنی زندگی اور پبلک زندگی کے درمیان، مذہب اور سیاست کے درمیان کوئی سرحد تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔

۳- ایک تہذیب کو جوڑے رکھنے کے لیے الحق پر یقین کی قوت کا کوئی بدل نہیں' کہ اس سے طاقت ور کوئی قوت نہیں - مزید ستم یہ --- یہ ماجرا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آ رہا -- کہ یہ نئے لوگوں کو بھی کھینچ رہا ہے اور الحق کے دعوے پر مبنی اس تہذیب میں شریک بننے کے لیے لوگ ہجوم کر رہے ہیں -

۴- لہٰذا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ دوسری قومیں ' خصوصاً یورپین ' اسلام اور مسلمانوں سے خوف زدہ ہیں - انھیں خطرہ ہے کہ ایک نئی سرد جنگ آ رہی ہے ' جو غالباً "سرد" نہ رہے گی -

۵- لیکن کوئی وجہ نہیں کہ مغرب اور اسلام امن و آشتی کے ساتھ باہم گزر نہ کر سکیں - دونوں میں بہت کچھ مشترک ہے - بس اس مقصد کے لیے دونوں کو حکمت کے ساتھ معاملہ کرنا ہو گا ' اپنے خیالات اور تصورات پر نظر ثانی بھی کرنا پڑے گی - خاص طور پر مسلمانوں کو ' جنھیں کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا ہو گا جس کے ذریعہ وہ ماڈرن زندگی کے تین پہلوؤں سے ضرور ہم آہنگ ہو جائیں ' یعنی ماڈرن بن سکیں: ۱- معیشت ' ۲- عورت ' ۳- جمہوریت -

۶- معیشت میں سود کے بغیر گزر نہیں ' اگرچہ اسلام کے مشارکت ' مضاربت کے نظام سے مغرب بھی کچھ سیکھ سکتا ہے ("کاش ' علماے قرآن کے پاس اکنامکس کی ڈگریاں ہوتیں!") -

۷- عورت کو آزاد کرنا ہو گا - اس کے لیے اسے معاشی طور پر خود کفیل بنانا ہو گا - "مغرب سے جتنے انقلابات پھوٹے ہیں ' ان میں سب سے عظیم انقلاب عورت اور مرد کے تعلقات میں انقلاب ہے - اسلام نے اس کو اختیار نہ کیا ' تو وہ تنہا رہ جائے گا" -

۸- سب سے بڑی تبدیلی ' خود کو ماڈرن بنانے کے لیے ' جو اسلام کو کرنا ہو گی ' وہ "جمہوریت" کا اختیار کرنا ہے - جمہوریت [ایسے سیاسی نظام کے معنوں میں نہیں جہاں حکمرانوں کے عزل و نصب اور امور اجتماعی کے فیصلے رائے عامہ سے ہوتے ہوں ' بلکہ ایسے فلسفے کے پیرو معاشرے کے معنوں میں] جو کسی الحق ' حتمی سچائی ' پر ایمان و یقین کی بنیاد پر قائم نہ ہو ' یا کم سے کم کسی کو دوسرے پر اپنا ایمان و یقین مسلط کرنے کی اجازت نہ دے ' جہاں ہر شخص کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہو کہ کیا نیکی ہے اور کیا بدی ' کیا جائز ہے اور کیا ناجائز - "الحق" کے تصور اور مقام کو مسترد کر کے ہی تو مغرب میں جمہوریت پیدا ہوئی -

۹- عورت کی آزادی ہو ' یا فرد کی آزادی ' [ہدایت الٰہی پر یقین اور اس کے اتباع سے] یہ آزادی ممکن نہیں جب تک ایک ادارہ بالکل بدل نہ دیا جائے: یعنی علماے اسلام کا ادارہ: "تعداد میں قلیل ' اول تا آخر مرد ہی مرد ' خود ساختہ ' اور منشاے الٰہی بتانے کا حق رکھنے کے مدعی" - علما کا اصل ہتھیار ہے اجتہاد: قرآن صدائے الٰہی ہوا کرے ' اس کی صرف ۸۰ آیات قوانین و ضوابط کے بارے

میں کچھ کہتی ہیں ' وہ بھی محتاج تشریح ہیں ' تشریح و اجتہاد کا حق ' اجماع کا حق ' علما نے صدیوں سے ہائی جیک کیا ہوا ہے۔ "بدقسمتی سے مسلمان آج بھی قرآن کی تعبیر و تشریح علما کے اس چھوٹے سے گروہ کے ہاتھوں میں چھوڑے رکھنے کے لیے تیار ہیں ' اور یہ یقین بھی رکھتے ہیں کہ صرف ان ہی کی تعبیر آزادانہ ہوتی ہے"۔ وہ اب تک علما سے "نہیں (No)" کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہے۔ چنانچہ "اسلام ابھی تک ایک قلیل 'مطلق العنان گروہ کی بالادستی کی دنیا میں رہ رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ وہ اب بھی "الحق" کے وجود پر یقین رکھتا ہے"۔

۱۰۔ علما "عورت کی آزادی" کو روکے بیٹھے ہیں۔ انھوں نے صدیوں پیش تر عورت کے مقام کے بارے میں غلط اجتہاد کیا ' اب بھی کیے جا رہے ہیں۔ اس لیے اگر اسلام عورت کو وہ مساوات دینا چاہتا ہے جو "کم و بیش" قرآن نے دی ہے ' تو اسے علما کی گرفت اور قوت کو توڑنا ہو گا۔

۱۱۔ اسی طرح جمہوریت کے فلسفے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھوڑے سے علما کی بالادستی ہے ' جو خدا کی ترجمانی کے مدعی ہیں۔ عیسائی چرچ کی طرح بے شک نہیں ' مگر اسلام میں بھی ائمہ ' علما اور مفتیوں کا ایک نظام ہے ' اور اس "تھکے ماندے ' مصالحت پسند اور ذلیل نظام" کو ختم کیے بغیر اسلام کی قدیم پرجوش قوت کا احیا نہیں ہو سکتا۔ خدا کس چیز کی اجازت دیتا ہے کس چیز سے منع کرتا ہے ' اس کا فیصلہ کرنے کا حق اب علما کے محدود ادارہ سے سارے مسلم عوام کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے۔

[بدقسمتی سے اسلام کی پہلی صدی میں کوئی سینٹ پال پیدا نہیں ہوا جو دین کو شریعت کے شکنجے سے آزاد کر دیتا ' لیکن] اب اسلام کی پندرھویں صدی میں ریفارمیشن کی لہر ناگزیر ہے ' عیسائیت کی پندرھویں صدی کی طرح ' جس کے نتیجے میں مارٹن لوتھر نے ۱۵۱۷ میں چرچ کے دروازے پر اپنے مطالبات آویزاں کر کے یورپ میں پادریوں کے اقتدار کے تابوت میں پہلی کیل ٹھونک دی تھی۔

تجزیہ نگار کی تحریر کم علمی ' خود ساختہ مفروضات ' اور مغالطہ آمیز نتائج کا مرقع ہے۔ ان پر گفتگو کی یہاں گنجایش نہیں۔ لیکن چند وضاحتیں ضروری ہیں:

اسلام میں قرآن مجید کی تعبیر و تفسیر اور تنفیذ کی امانت کسی چرچ کی نہیں ' امت کی تحویل میں دی گئی ہے۔ عالم و مفتی ' پادری کی طرح کا منصب نہیں ' بلکہ ایک اہلیت کا نام ہے۔ عالم کون ہے ' اس کی بھی کوئی متعین تعریف نہیں۔ کوئی عالم تعبیر کے حق پر اپنے اجارہ کا مدعی نہیں ہو سکتا ' کیونکہ وہ جب فتویٰ لکھتا ہے تو یہ ضرور لکھتا ہے کہ "یہ میری رائے ہے ' علم صرف اللہ کے پاس ہے ' وہی صحیح جانتا ہے"۔ کسی عالم کے پاس نہ پہلے اتنا اقتدار رہا ہے کہ وہ اپنا اجتہاد دوسروں پر مسلط کر دے ' نہ اب ہے۔ مگر کوئی حکومت بھی ' اقتدار کے باوجود ' اپنی تعبیر لوگوں پر مسلط نہیں کر سکی ہے ' نہ آیندہ کر سکے گی

حقیقت یہ ہے کہ پہلے دن سے ' عام مسلمانوں نے جن علما پر اعتماد کیا ' انھی کو ' اور انھی کے اجتہاد و تعبیر کو ہمیشہ سند قبول اور بقا حاصل ہوئی۔ یہ ''جمہوری حق'' تو ' بغیر بیلٹ کے ' نیچے عوام ہی کے پاس رہا ہے۔ مگر تلخ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف آج کی ماڈرن تعبیرات ہیں جو اتاترک ' جمال عبدالناصر اور ایوب خان جیسے فوجی ڈکٹیٹروں نے اوپر سے نافذ کی ہیں۔ وہ تعبیرات جن کے بارے میں تجزیہ نگار یہ آس لگائے ہوئے ہے کہ ''عوامی اجتہاد'' ہو تو وہ نیچے سے نافذ ہوں گی۔

بے شک ۱۴۰۷ میں بائبل پہلی دفعہ چھپ کر عیسائیوں کے ہاتھ آئی تو انھیں پتہ چلا کہ اس میں کیا لکھا ہے ' اور نتیجتاً ریفارمیشن کی لہر پیدا ہوئی۔ مگر قرآن مجید تو روز اول سے مسلمانوں کے سینوں اور ہاتھوں میں رہا ہے۔ اور اب ۱۴۱۵ھ تک پہنچتے پہنچتے تو صدیاں ہوگئیں کہ تقریباً ہر زبان میں لوگ اس کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں لیکن مضمون نگار اس کی کیا توجیہ کرے گا کہ لوگ جتنا زیادہ قرآن پڑھتے ہیں ' اتنا ہی زیادہ وہ ریفارمیشن کے بجائے فنڈامنٹلزم کی طرف لپکتے ہیں۔

اس تجزیے سے یہ بات ضرور روز روشن کی طرح آشکار ہوتی ہے کہ مغرب مدارس کو ایک خطرہ عظیم اس لیے سمجھتا ہے کہ اس کی نظر میں اس کے تہذیبی غلبہ اور قیادتِ عالم کی بقا ' اور تہذیبی جنگ میں اسلام کے اوپر (اس کو مغرب کے رنگ میں رنگ کر) فتح کی راہ میں مدارس ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ کیونکہ دینی تعلیم ہی سے مسلمانوں کے اندر کائنات میں الحق کے وجود ' اور قرآن اور رسالت محمدی کے الحق ہونے پر یقین ' ۱۴سو سال سے زندہ اور قائم ہے ' اور الحق کے ساتھ ربط بھی۔ ملت کی وحدت ' قوت اور توسیع کا راز اس یقین میں پوشیدہ ہے ' اور اس یقین کی قوت کا کوئی جواب مغرب کے پاس نہیں۔

ہندو پاکستان میں تعلیم کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ولیم ہنٹر نے انیسویں صدی میں اسی بات کا اظہار یوں کیا تھا۔ ''شرع محمدی'' کو ہرگز تعلیم کا مقصد نہ بنانا چاہیے ' کیونکہ شرع محمدی'' کا مطلب ہے مسلمانوں کا مذہب ' اور مذہب بھی اس زمانے کا جب اس کے پیرو تمام دنیا کو اپنی جائز شکار گاہ سمجھتے تھے اور انھوں نے زمانہ حال کی مسلمان آبادیوں کی طرح عیسائیوں کے ساتھ اتحاد کر کے یا ان کی رعایا بن کر رہنا نہ سیکھا تھا''۔

اب یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ دینی مدارس کے خلاف مغرب کی مہم ' خواہ آج ہو جب وہ ہمارے اوپر ہمارے حکمرانوں کے واسطے سے مسلط ہیں ' یا ماضی میں جب وہ براہ راست مسلط تھے ' ایک عظیم تہذیبی جنگ میں کلیدی مقام رکھتی ہے۔ افسوس ان مسلمان حکمرانوں ' دانش وروں اور انگلش میڈیا پر

ہے جو مغرب سے بڑھ کر مغرب کی وفاداری کی روش پر گامزن ہیں ' اور شرعِ محمدی ﷺ کی تعلیم کو بے اثر یا ختم کرنے کے درپے ہیں ۔ شاید وہ ایک مرتبہ پھر عیسائیوں کی "رعایا" بن کر رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں ' اور ساری امت کو بھی یہی سبق سکھانا چاہتے ہیں ۔

جب برصغیر میں پہلی بار بیرونی آقاؤں کی طرف سے مسلمانوں کو عیسائیوں کی رعایا بن کر رہنے کا سبق سکھانے کی مہم شروع ہوئی ' تو علما نے آگے بڑھ کر اس حملہ کے خلاف دفاعی بند باندھا ' اور ملک کے طول و عرض میں مدارس کا جال بچھا دیا ۔ اس دفاعی مہم میں ۳ مئی ۱۸۶۷ / ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ کو دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی ' اور جس زور و شور کے ساتھ مغرب کے سیاسی و تمدنی غلبے کا سیلاب آ رہا تھا ' اس کو دیکھتے ہوئے ان مدارس کے بانیوں نے جو منصوبہ بنایا اور خدمات انجام دیں شاید اس سے زیادہ کچھ سوچنا اور کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا ۔ اس لیے آج کی دنیا میں بیٹھ کر کل کی دنیا کے بارے میں رومانوی فتوے صادر کرنا --- کہ یہ ہونا چاہیے تھا ' اور یہ خامی تھی --- ایک بے سود مشغلہ ہے ۔

دینی مدارس نے علومِ نبوت کے تحفظ ' ان کی تعلیم و اشاعت ' ان میں اضافہ و ترقی ' اور مغربی افکار و تمدن کا جواب دینے میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں ان کا اعتراف نہ کرنا اور انھیں خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بخل ہو گا ۔ لیکن ایک زندہ قوم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر کوشش اور ہر معرکے کا جائزہ لے ' کوتاہیوں اور خامیوں کا تعین کرے ' اصلاح و بہتری کی فکر کرے اور اسے مستقبل کے تقاضے پورے کرنے کا اہل بنائے ۔ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا ..... الخ ۔ (آل عمران ۳ : ۱۴۷) پھر ' آج تو مدارس کو ایک بالکل نئی نوعیت کا اور کہیں زیادہ بڑا چیلنج درپیش ہے ۔ اسلام اور مغرب کے درمیان معرکہ برپا ہونے والا ہے ۔ دشمن نے مدارس کو اپنے اہداف میں سرِفہرست رکھا ہے ۔ مستقبل بے شک بڑا پُرخطر ہے ' لیکن عظیم الشان امکانیات سے بھرپور بھی ۔ ملت کے احیا ' امت کے مشن کی تکمیل ' اسلام کے تہذیبی غلبے ' دنیائے اسلام کے لیے روشن مستقبل اور انسانیت کے لیے امن و سلامتی کی زندگی کی امکانیات ۔

مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کو دشمن تو قرار دے لیا ہے ' مگر ملت جس پستی و درماندگی ' ضعف و انحطاط ' تفرقہ و انتشار ' علمی و فکری جمود اور معاشی بدحالی و سیاسی عدم استحکام کا شکار ہے ' اس کو دیکھتے ہوئے ' عالمِ اسباب کی حد تک ' سمجھ میں نہیں آتا کہ مقابلہ کیسے ہو گا ۔ اسی طرح دشمن نے مدارس کو اپنے اہداف میں سرِفہرست رکھ تو لیا ہے ' لیکن یہ تصور کرنا بھی دشوار ہے کہ اپنی خامیوں ' کوتاہیوں اور قلتِ وسائل کے ساتھ وہ دشمن کے مقابلے میں کیسے کامیاب ہوں گے ۔ لیکن دنیا میں تاریخ کی کوئی

کروٹ سلسلۂ اسباب کو دو اور دو چار کی طرح جمع کرنے کے نتائج پر منحصر نہیں ہوتی۔

مدارس کہاں کھڑے ہیں' اور انھیں کیا کرنا چاہیے' اس موضوع پر ان شاء اللہ دینی تعلیم سے متعلق علما و مفکرین کی قدیم و جدید تحریروں سے مرتب کر کے ایک قلمی مذاکرہ ہم جلد قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔ آج ہم انتہائی ادب کے ساتھ صرف چند جامع بنیادی امور کی طرف مدارس کے اربابِ حل و عقد کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں:

۱- ۱۸۵۷ کے بعد دینی تعلیم کی حکمتِ عملی دفاعی حکمتِ عملی تھی' اس کا اصل اور بنیادی مقصد "تحفظ" تھا۔ قاری محمد طیبؒ لکھتے ہیں: "اجماع اس پر منعقد ہوگیا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے تا کہ اس ملک میں مسلمانوں کا دین محفوظ ہو جائے"۔ لیکن اس میں یہ تمنا بھی شامل تھی کہ "گو ان کی اسلامی شوکت پامال ہو چکی ہے' لیکن اگر دین اور دینی جذبات محفوظ ہو جائیں گے' تو ایسا وقت آنا بھی ممکن ہے کہ وہ ان دینی جذبات سے رہتی دنیا کو بھی سنوار سکیں" (ماہنامہ الرشید، دارالعلوم نمبر' لاہور' ص ۱۳)

یہ ادراک سب سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ وقت آگیا ہے۔

تحفظ علومِ نبوت کے ورثے کا بھی مطلوب تھا' مسلمانوں کے دین و ایمان کا بھی۔ خدا کے فضل سے اس مقصد میں کافی کامیابی ہوئی۔ یہ کامیابی' اپنی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود' انھی مدارس کے ذریعے ممکن ہوئی' کہ دورِ انحطاط میں تقلید کا نسخہ ہی کارگر ہو سکتا ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا:

> ان مکتبوں (مدرسوں) کو اسی حالت میں رہنے دو' غریب مسلمانوں کے بچوں کو انھی مدارس میں پڑھنے دو۔ اگر یہ مُلّا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ جو کچھ ہو گا میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر ہندستانی مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہو گا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود --- اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔

تحفظ کا مقصد اب بھی مطلوب رہے گا' لیکن اب معاملہ دفاع سے بہت آگے چلا گیا ہے۔ آج ایک بالکل نئی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے' جس کا مرکزی نکتہ "اقدام" ہونا چاہیے۔ ایمان' رسوخ فی العلم' حکمت' اجتہاد اور جہاد' اس حکمتِ عملی کے لازمی اجزا ہوں گے۔ علامہ اقبال کو دورِ جدید کے اس چیلنج کا بھی شدت سے احساس تھا' اور نظم و نثر میں انھوں نے اس بارے میں اپنے اضطراب کا شدت

کے ساتھ اظہار کیا ہے۔

۲۔ علمی و فکری اور تہذیبی سطح پر مغرب نے بے شمار انقلابات برپا کیے ہیں۔ روز نت نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں' ان کا علم اور فہم و ادراک نہایت ضروری ہے۔ اور ایمان و حکمت اور اجتہاد کے ساتھ ان کا مقابلہ اور ان کے مقابلے میں جوابی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت اور جدوجہد بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ تفقہ فی الدین کا مطلب صرف احکام و مسائل کا علم نہیں' حکمت اور مجتہدانہ نظر و صلاحیت بھی ہے۔

۳۔ تفقہ فی الدین کا ناگزیر تقاضا انذار عام ہے (التوبہ)۔ انذار عام کی صلاحیت اور کاوش کے بغیر امت نہ مغرب کے مقابلے کے لیے تیار ہو گی' نہ شریعت کا 'قول ثقیل کا بار اٹھانے کی استعداد اس کے اندر پیدا ہو گی۔

۴۔ امت میں اتحاد و اخوت کے بغیر علم کی بڑی سے بڑی مقدار بھی غیر موثر رہے گی۔ تعبیر' تشریح' فتاوی' رد و قدح' اختلافات' سب میں اس بنیادی مقصد کے لیے صلاحیت پیدا کرنا اور مناسب حکمت عملی اختیار کرنا ضروری ہے۔

ان چار نکات کی وسعت میں ہر چیز سما سکتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ گزارشات واجب الاحترام علما اور دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کے لیے قابل توجہ قرار پائیں گی۔

اقامتِ دین اور جماعتی زندگی

ایک بزرگ عالمِ دین جماعت کی دعوت اور طریق کار کو عین حق سمجھتے ہیں اور جماعت کے باقاعدہ متفق بھی ہیں' ان کا خیال ہے کہ فریضہ اقامت دین فرضِ عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔اس لیے جب کچھ لوگ حصہ لے رہے ہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ اس میں ہرایک شخص حصہ لے۔اگر کسی شخص کی دنیوی مصلحتیں اسے اس کام سے روکتی ہیں اور وہ اقامت دین کے لیے کوئی کام نہیں کرتا' تو اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کوئی مواخذہ نہیں ہو گا۔

رہی جماعت کی تنظیم' اس سے منسلک ہونا' اس کے امیر کی اطاعت' اس راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر اور اس نصب العین کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانیاں' تو ان امور کو وہ بالکل نوافل کا درجہ دیتے ہیں۔چنانچہ وہ صاف الفاظ میں کہتے ہیں کہ یہ امور تو ایسے ہیں جیسے نماز تہجد۔

وہ کہتے ہیں ایسی مختلف تنظیمیں جو مختلف ادوار اور مختلف ممالک میں دین کا کام کرنے کے لیے قائم ہوں' ان کے نظم کی پابندی اور اس کے اولو الامر کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ اطاعت تو رسول اللہ ﷺ اور خلفاے راشدین ؓ کی فرض تھی نہ کہ ایسی جماعتوں کے امرا کی۔

جن عالمِ دین کا یہ خیال ہے ان کو غلط فہمی یہ ہے کہ اقامتِ دین کی سعی ہر حال میں صرف فرض کفایہ ہے۔حالانکہ یہ فرض کفایہ صرف اسی حالت میں ہے جب کہ آدمی کے اپنے ملک یا علاقے میں دین قائم ہو چکا ہو' اور کفار کی طرف سے اس دارالاسلام پر کوئی ہجوم نہ ہو' اور پیشِ نظر یہ کام ہو کہ آس پاس کے علاقوں میں بھی اقامت دین کی سعی کی جائے۔اس حالت میں اگر کوئی گروہ اس فریضے کو انجام دے رہا ہو تو باقی لوگوں پر فرض ساقط ہو جاتا ہے' اور معاملہ کی نوعیت نماز جنازہ کی سی ہوتی ہے۔

لیکن اگر دین خود اپنے ہی ملک میں مغلوب ہو' اور خدا کی شریعت متروک و منسوخ کر کے رکھ دی گئی ہو' اور علانیہ منکرات اور فواحش کا ظہور ہو رہا ہو' اور حدود اللہ پامال کی جارہی ہوں' یا اپنا ملک دارالاسلام تو بن چکا ہو مگر اس پر کفار کے غلبے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہو' تو ایسی حالتوں میں یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین ہوتا ہے' اور ہر وہ شخص قابلِ مواخذہ ہو گا جو قدرت و استطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے لیے جان لڑانے سے گریز کرے گا۔

اس معاملے میں کتب فقہ کی ورق گردانی کرنے سے پہلے صاحبِ موصوف کو قرآن مجید پڑھنا

جاتا ہے' جس میں جہاد سے جی چرانے والوں کو سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں ' حتیٰ کہ انھیں منافق تک ٹھیرایا گیا ہے ' حالانکہ وہ نماز روزے کے پابند تھے ۔ قرآن اس طرح کے حالات میں جہاد ہی کو ایمان کی کسوٹی قرار دیتا ہے ' اور اس سے دانستہ گریز بلکہ تساہل برتنے والوں کی کسی اطاعت کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھتا ۔

اس کے بعد اگر کسی توثیق کی ضرورت صاحب موصوف کو محسوس ہو تو وہ فقہ کی کتابوں میں جہاد کی بحث نکال کر دیکھ لیں کہ دارالاسلام پر ہجومِ عَدُو کی صورت میں جہاد فرض کفایہ ہے یا فرض عین ۔ جس زمانے میں فقہ کی یہ کتابیں لکھی گئی تھیں اس وقت ممالکِ اسلامیہ میں سے کسی جگہ بھی اسلامی قانون منسوخ نہیں ہوا تھا اور نہ حدود شرعیہ معطل ہوئی تھیں ' اس لیے انھوں نے صرف ہجومِ عَدُو ہی کی حالت کا حکم بیان کیا ہے ۔ لیکن جب کہ مسلمانوں کے اپنے وطن میں کفر کا قانون نافذ اور اسلام کا قانون منسوخ اور اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو حدود اللہ کی اقامت کو وحشیانہ فعل قرار دیتے ہیں ' تو معاملہ ہجومِ عدو کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ سخت ہو جاتا ہے ' اور اس صورت میں کوئی شخص جو دین کا کچھ فہم بھی رکھتا ہو اقامتِ دین کی سعی کو محض فرض کفایہ نہیں کہہ سکتا ۔

رہا نظم جماعت تو اس کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ احکامِ کفر کے مقابلے میں احکامِ الٰہی کے اجرا کی کوشش بہرحال منظم اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتی ۔ لہٰذا اس کے لیے جماعت کا وجود اور جو جماعت موجود ہو اس کا التزام ضروری ہے ۔ اس مضمون پر کثیر التعداد احادیث دلالت کرتی ہیں ۔ البتہ جہاں تمام اہلِ ایمان کی ایک جماعت موجود نہ ہو اور اس مقصد عظیم کے لیے اجتماعی قوت پیدا کرنے کی مختلف کوششیں ہو رہی ہوں ' تو التزام جماعت کے ان احکام کا اطلاق تو نہ ہو گا جو الجماعت کی موجودگی میں شارعؑ نے دیے ہیں ۔

لیکن کوئی ایسا شخص جو اقامتِ دین کے معاملے کی شرعی اہمیت سے واقف ہو ' اور اس معاملہ میں ایک مومن کے فرض کا احساس رکھتا ہو ' ان کوششوں کے ساتھ بے پروائی کا رویّہ اختیار نہیں کر سکتا ۔ اس کے لیے لازم ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ ان کا جائزہ لے اور جس کوشش کے بھی صحیح و برحق ہونے پر مطمئن ہو جائے اس میں خود بھی حصہ لے ۔ پھر حصہ لینے کی صورت میں (یعنی جب کہ آدمی ایک جماعت کو برحق جان کر اس سے وابستہ ہو چکا ہو) نظم و اطاعت کا التزام نہ کرنا سراسر ایک غیر اسلامی فعل ہے ۔

یہ اطاعت محض نفل نہیں بلکہ فرض ہے ' کیونکہ اس کے بغیر فریضہ اقامت دین عملاً ادا نہیں ہو سکتا ۔ احادیث میں اطاعتِ امر کے جو احکام آئے ہیں اور خود قرآن میں اطاعت اولوالامر کا جو فرمان خداوندی آیا ہے ان کے متعلق یہ سمجھنے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ احکام صرف رسول اللہ ؐ اور

خلفائے راشدین ؓ کے عہد کے لیے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اب نہ کوئی اسلامی حکومت چل سکتی ہے اور نہ کبھی جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتا ہے کیونکہ نظام کی پابندی اور سمع و طاعت کے بغیر ان چیزوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ میں سخت حیران ہوں کہ کوئی شخص جس کو علمِ دین کی ہوا بھی لگی ہو' ایسی بے سروپا باتیں کیسے کہہ سکتا ہے۔

اکثر میرے ذہن میں یہ سوال ابھرتا رہا ہے کہ اسلام کے ارکان کی حیثیت سے پانچ چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے' ان میں فریضہ اقامت دین کی جدوجہد شامل نہیں ہے' حالانکہ اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے چھٹے رکن کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے تھی۔ صراحتاً فرمایئے کہ دین کے اوامر میں فریضہ اقامت دین کی کیا حیثیت ہے؟

فریضہ اقامتِ دین کی حیثیت سمجھنے میں آپ کو الجھن اس لیے پیش آئی ہے کہ آپ ارکانِ اسلام اور فرائضِ اہلِ ایمان میں فرق نہیں کر رہے ہیں۔ ارکان اسلام وہ ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت قائم ہوتی ہے اور فرائضِ اہلِ ایمان وہ مقتضیاتِ ایمان ہیں جنھیں اسلامی زندگی کی تعمیر کے بعد پورا کیا جانا چاہیے۔ ارکان اسلام قائم نہ ہوں تو سرے سے اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہی نہ ہوگی' لیکن اس عمارت کے کھڑے ہو جانے کے بعد اگر مقتضیاتِ ایمان پورے نہ کیے جائیں تو یہ ایسا ہوگا جیسے جنگل میں ایک بے مصرف اور ویران عمارت کھڑی ہے۔ فریضہ اقامتِ دین اسلام کا ستون نہیں ہے' بلکہ وہ اسلام کی عمارت تعمیر کرنے کے مقاصد میں سے اہم ترین مقصد ہے۔ مزید برآں اسی پر اس عمارت کے استحکام اور اس کی آبادی اور اس کی توسیع کا انحصار ہے۔ اگر اس فرض کو مہمل چھوڑ دیا جائے تو اسلام کی عمارت بتدریج بوسیدہ ہو جائے گی' اور اس میں فسق و کفر کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا' اور اس کے وسیع ہو کر جمیع خلائق کے لیے پناہ گاہ بننے کا کوئی امکان ہی نہ ہوگا۔ اسی لیے اس کام کو اسلام میں مسلمان کی زندگی کے مقصد کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۲: ۱۴۳) اور كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران ۳: ۱۱۰)۔

ایک بزرگ پہلے جماعت سے اس حد تک تعلق رکھتے تھے کہ رکنیت کی درخواست دینے والے تھے' لیکن یکایک ان کے ذہنِ رسا میں ایک نکتہ پیدا ہوا اور وہ اپنا دامن جھاڑ کر جماعت سے اتنی دور جا کھڑے ہوئے گویا انھیں جماعت سے کبھی کوئی تعلق رہا ہی نہیں تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی دستور کی تشکیل کے بعد پاکستان ایک اسلامی ریاست بن چکا ہے' اور یہاں تمام مسلمان شہری ایک نظامِ اطاعت میں منسلک ہو چکے ہیں۔ یہ نظامِ اطاعت سب کو جامع اور سب پر فائق ہے۔ اب سب کی اطاعتیں اس بڑے نظامِ اطاعت کے گرد جمع ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اس کی موجودگی میں کسی اور نظم کا قائم ہونا اور افراد سے اپنی

اطاعت کا مطالبہ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک حکومت کے اندر ایک متوازی حکومت کا قائم کرنا۔ تمام مسلمان شہری اب کسی جماعت کے نہیں بلکہ اس ریاست کی ہمہ گیر تنظیم کے رکن ہیں' اور اب ان کی تمام اطاعتیں اور وفاداریاں اسی تنظیم کا حق ہیں نہ کہ کسی اور جماعت کا۔ اب اطاعت کسی کی نہیں بلکہ ریاست کے صدر کی ہونی چاہیے۔ اس استدلال کا کیا جواب ہے؟ کیا اسلامی ریاست واقعی ایک ایسی ریاست ہوگی جس میں کسی دوسری پارٹی کو جنم لینے اور جینے کا موقع نہیں ملے گا؟ اگر ملے گا تو ایک نظام اطاعت کے لحاظ سے اس کی کیا حیثیت ہوگی؟ کیا اب کسی مسلمان کا یہ استدلال درست ہے کہ اب اسے اسلام کے اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کسی جماعت میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ایک اسلامی ریاست کا ایک شہری ہے۔

جن صاحب کا یہ موقف ہے ان کی عقل نے وہ نکتہ پیدا کیا جو ابھی تک موجودہ "امراء المومنین" کو بھی نہیں سوجھا ہے۔ اگر یہ بات انھیں سوجھ جائے تو ملک کی تمام جماعتوں کو بیک جنبشِ قلم ختم کر کے ہمیشہ کے لیے ہر اس شخص کا منہ بند کر دیں جو یہاں احکامِ اسلامی کے اجرا کا نام لے' اور پھر یہاں صرف رقص و سرود اور فسق و فجور ہی ہوتا رہے۔ اس کے بعد تو یہاں اطمینان کے ساتھ انگریزی دور کے قوانین چلتے رہیں گے اور شریعت کے نفاذ کی جدوجہد کرنے والے دنیا ہی میں نہیں آخرت میں بھی سیہ رُو اور مستحقِ عذاب ٹھہریں گے کیونکہ شرعاً وہ نفاذ شریعت کی سعی کرنے کے مجاز ہی نہ ہوں گے۔ مجھے تو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ جن صاحب کی عقل و خرد کا یہ حال تھا وہ جماعت کو چھوڑ کر دُور چلے گئے۔

اسلامی ریاست کی ایک حالت وہ ہوتی ہے جس میں ریاست صرف نظریے کے اعتبار ہی سے اسلامی نہ ہو بلکہ عملاً حکومت بھی اسلامی ہو۔ صالح و متقی اہل ایمان اس کو چلا رہے ہوں' شوریٰ کا نظام اپنی حقیقی اسلامی روح کے ساتھ قائم ہو' اور پورا نظامِ حکومت ان مقاصد کے لیے کام کر رہا ہو جن کی خاطر اسلام اپنی ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں ریاست کا صدر ہی تمام اہلِ ایمان کا لیڈر ہو گا اور اس کی قیادت میں تمام اہلِ ایمان ایک جماعت ہوں گے۔

دوسری حالت وہ ہے جس میں ریاست صرف نظریے کے اعتبار سے اسلامی ہو' باقی خصوصیات اس میں نہ پائی جاتی ہوں۔ اس حالت کے مختلف مدارج ہیں اور ہر درجے کے احکام الگ ہیں۔ بہرحال ایسی حالت میں اصلاح کے لیے منظم اجتماعی کوشش کرنا ناجائز تو کسی طرح نہیں ہے' اور بعض صورتوں میں ایسا کرنا فرض بھی ہو جاتا ہے۔ اسے ناجائز قرار دینے کا خیال اسلامی ریاست کے فاسق حکمران کریں تو کریں' لیکن یہ عجیب بات ہوگی کہ اس کے صالح شہری بھی اسے ناجائز مان لیں' در آں حالیکہ اس کے عدم جواز کی کوئی شرعی دلیل سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگر یہ چیز ناجائز ہو تو آخر ان ائمہ مجتہدین کا کیا مقام قرار پائے گا جنھوں نے بنی امیّہ کے خلاف اٹھنے والوں کی خفیہ اور اعلانیہ تائید کی؟ (اخذ و ترتیب (خرم مراد): رسائل و مسائل 'حصہ چہارم' ص ۳۶ تا ۲۵)

نفسِ مُطمئنّہ

سید قطب

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ، وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ (الفجر ۸۹: ۱۵-۱۶)

انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب اسے عزت و نعمت دے کر آزماتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میرا اعزاز و اکرام کیا! اور جب اسے (اس طرح) آزماتا ہے کہ اس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری بے عزتی کی!

اللہ تعالیٰ جب انسان کو مختلف حالات --- رزق کی کشادگی و تنگی اور دولت و غربت وغیرہ --- سے آزماتا ہے تو اس کے تصورات عام طور پر اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اسے نعمتیں بخشتا ہے اور دولت و منصب عطا کر کے اسے عزت دیتا ہے' تو وہ یہ نہیں سمجھتا کہ دولت و عزت کے ذریعہ اس کی آزمائش ہو رہی ہے' اور اس کے نتیجے میں اسے جزا یا سزا ملنے والی ہے! وہ اپنی دولت اور اپنے یا عزت مقام کو اس بات کی دلیل خیال کرتا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک اعزاز و اکرام کا مستحق ہے۔ یہ نادان آزمائش کو جزا اور امتحان کو نتیجہ خیال کرتا ہے' وہ دنیا کے ساز و سامان کو خدا کے اعزاز و اکرام کا ثبوت سمجھتا ہے --- اس کے برعکس جب اللہ تعالیٰ اس پر رزق تنگ کر دیتا ہے' تو وہ اس آزمائش کو سزا اور اس امتحان کو عذاب سمجھتا ہے۔ وہ رزق کی تنگی سے اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ خدا کی نظر میں ذلیل و خوار ہے۔ اگر خدا کو اسے ذلیل و خوار نہ کرنا ہوتا تو وہ اسے رزق کی تنگی میں مبتلا نہ کرتا۔

انسان دونوں حالتوں میں غلطی پر ہے: تصور میں بھی غلطی' اندازے اور پیمانے میں بھی غلطی۔ رزق کی کشادگی یا تنگی اللہ کی طرف سے اس کے بندے کی آزمائش ہے' تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ نعمتیں پاکر خدا کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا کبر و غرور میں مبتلا ہو کر آپے سے باہر ہوتا ہے' پریشانی اور تکلیف میں صبر

کرتا ہے یا بے صبری و بے قراری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جیسی کچھ اس کی روش ہوگی' اسی کے مطابق اسے بعد میں بدلہ ملے گا۔

کسی شخص کو دنیا کا ساز و سامان بخشا گیا یا وہ محروم رکھا گیا' یہ جزا و سزا نہیں ہے۔ خدا کے یہاں انسان کی قدر و قیمت کیا ہے' اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ اس کے پاس دنیوی سرو سامان کس قدر ہے۔ نہ دنیا میں خدا کے دینے یا نہ دینے سے یہ استدلال کرنا چاہیے کہ وہ بندے سے خوش یا ناخوش ہے۔ خدا نیک اور بد' دونوں کو بخشتا ہے' خدا نیک و بد' دونوں کو محروم کرتا ہے۔ دنیا میں اس کی بخشش اور عدم بخشش قابل لحاظ نہیں ہے۔ وہ دیتا ہے تاکہ دے کر آزمائے' وہ محروم رکھتا ہے تاکہ محروم رکھ کر آزمائے۔ اصل چیز جو قابل اعتنا ہے' وہ اس آزمائش کا رزلٹ ہے۔

انسان کا دل ایمان سے خالی ہوتا ہے تو وہ خدا کے دینے اور نہ دینے کی حکمت سمجھ نہیں پاتا۔ نہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی میزان میں کن چیزوں کی قدر و قیمت ہے اور اس کے پیمانے کیا ہیں۔ لیکن جب اس کا دل ایمان سے معمور ہوتا ہے تو اس کا ربط خدا سے ہو جاتا ہے' اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے یہاں کیا کچھ ہے۔ اس کی میزان میں دنیا کے حقیر ساز و سامان بے وزن ہو جاتے ہیں' آزمائش کے بعد جو جزا ملنے والی ہے' وہ اس کے لیے بیدار و مستعد ہو جاتا ہے۔ رزق کی کشادگی اور تنگی' دونوں حالتوں میں اس جزا کے لیے جدوجہد کرتا ہے' اور دونوں حالتوں میں خدا کی قضا و قدر پر مطمئن رہتا ہے اور دنیا کی ظاہری اور کھوکھلی قدر و قیمت کی حامل اشیا کے بغیر خدا کی میزان میں اپنی قدر و قیمت کو جان لیتا ہے۔

قرآن مکہ میں ایسے لوگوں کو خطاب کر رہا تھا—اور ایسے لوگ جاہلیت کے ہر دور اور ہر سماج میں پائے جاتے ہیں جن کا ربط زمین سے بلند تر اور وسیع تر کسی عالم سے نہیں ہوتا—جو روزی کی فراخی اور تنگی کے معاملے میں اپنے رب کے سلسلے میں اسی طرح کا خیال رکھتے تھے۔ لوگوں کی قدر و قیمت کو جانچنے کے لیے ان کے پاس یہی پیمانے تھے۔ دولت اور جاہ و منصب ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دولت سے شدید محبت رکھتے تھے۔ اور دولت سے اس محبت کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ حرص و طمع اور بخل کی گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا تھے۔ قرآن اس معاملے میں ان کی قلبی کیفیات سے پردہ اٹھاتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ رزق کی فراخی و تنگی کے سلسلے میں خدا کی آزمائش و ابتلا کو نہ سمجھنے کی اصل وجہ یہی حرص' طمع اور بخل کی بیماریاں ہیں۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ، وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ، وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ،

وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۱۷-۲۰)

ہرگز نہیں! تم یتیم کی توقیر نہیں کرتے! غریبوں کو کھلانے پلانے کی' ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے! میراث کو سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو! اور دولت کی محبت میں متوالے ہو رہے ہو!

اصل بات یہ ہے کہ تم خدا کی بخشش اور اس کی دی ہوئی دولت کا حق ادا نہیں کرتے۔ تم یتیم کی ---جو بچہ ہے اور باپ کے فوت ہونے کے بعد محافظ و سرپرست سے محروم ہو گیا ہے---توقیر نہیں کرتے۔ تم غریبوں کو---جو تمھارے درمیان موجود ہیں اور ضرورت مند ہونے کے باوجود سوال نہیں کرتے---کھلانے پلانے پر ایک دوسرے کو آمادہ نہیں کرتے۔ قرآن' غریبوں کو کھلانے پلانے کے سلسلے میں ایک دوسرے کو نہ ابھارنے اور تاکید نہ کرنے کو انتہائی قبیح فعل اور شدید برائی قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ فرائض و واجبات اور عمومی خیر کے کاموں کے سلسلے میں ایک دوسرے کو متوجہ کرنا اور ان کی کفالت کرنا سماج کی مشترک ذمہ داری ہے۔ اور یہ اسلام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

تم آزمائش کی حقیقت سے ناواقف ہو' آزمائش میں کامیابی کا حصول تمھارے پیش نظر نہیں ہے۔ کامیابی کا راستہ یہ تھا کہ یتیم کی توقیر کرتے اور غریبوں کے کھلانے پلانے کی' ایک دوسرے کو تاکید کرتے۔ لیکن تم اس کے برعکس بدترین لالچ میں مبتلا ہو۔ تم ترکے کا سارا مال ہڑپ کر جاتے ہو۔ تمھیں دولت سے بے پناہ محبت ہے۔ اور تمھارے دلوں میں محتاجوں کو کھلانے پلانے اور ان کی توقیر کرنے کا کوئی داعیہ نہیں رہ گیا ہے!

مکہ میں دولت جمع کرنے کی شدید حرص سے اسلام کو سابقہ درپیش تھا---اس چیز نے ان کے دلوں کو انتہائی سخت اور بے رحم بنا دیا تھا۔ وہ یتیموں کی' خصوصاً یتیم لڑکیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کی دولت کو مختلف طریقوں سے ہڑپ کر لیتے۔ میراث کے سلسلے میں ان کی لوٹ کھسوٹ بہت زیادہ تھی۔ سودی کاروبار کے ذریعہ دولت سمیٹنے کا عمل مکی سماج میں کھلم کھلا جاری تھا---یہ برائیاں ہر دور اور ہر مقام کے جاہلی سماج کی خصوصیت رہتی ہیں' آج بھی صورتِ حال یہی ہے۔

ان آیات میں ان کی قلبی کیفیات کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ان کیفیات و اعمال کی شدید مذمت اور ان پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ یہ بات لفظ کلّا---ہرگز نہیں---کی [ان آیات کے شروع اور آخر میں] تکرار سے بھی واضح ہوتی ہے' اور اندازِ بیان اور آیات کے آہنگ سے بھی۔ آیات کی آواز میں جو شدت ہے' اس سے ان کی حرص کی شدت کی تصویر کشی ہوتی ہے: وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا، وتحبون المال حبا جما

اس تصویر کشی اور ان کے بدترین اعمال کی شدید مذمت و تنقید کے بعد قرآن انھیں ایک خوفناک دھمکی دیتا ہے۔ اور یہ بات ایک ایسے آہنگ میں کہی گئی ہے جو قوی بھی ہے اور شدید بھی۔

كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ، وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ، وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ (۲۱-۲۳)

ہرگز نہیں! جب زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی، اور تمھارا رب صف بہ صف فرشتوں کے جلو میں نمودار ہوگا، اور جہنم اس دن لاحاضر کی جائے گی۔

"دُكَّتِ الْأَرْضُ" کا مطلب یہ ہے کہ زمین کو توڑ پھوڑ کر اس کے نشیب و فراز کو برابر کر دیا جائے گا۔ قیامت کے روز جو کائناتی انقلابات ہوں گے ان میں ایک انقلاب یہ بھی ہوگا۔ "تمھارا رب اور فرشتے صف بہ صف آئیں گے"۔ یہ امورِ غیب میں سے ہے جس کی حقیقت کو ہم اس زمین میں رہتے ہوئے نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ اس طرز بیان سے عظمت و جلال اور ہیبت و ہولناکی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح جہنم کے لائے جانے کا معاملہ ہے۔ ہم اس سے اتنی بات سمجھتے ہیں کہ جہنم عذاب پانے والوں سے قریب ہوگی اور عذاب پانے والے اس سے قریب۔ بس اتنی بات کافی ہے۔ رہی اس کی اصل حقیقت و کیفیت تو یہ بھی غیبی امور میں سے ہے جو اس دن تک مخفی رہیں گے جس کا علم خدا کو ہے۔

ان آیات اور ان کے تیز و تند آہنگ سے ایک ایسا منظر سامنے آتا ہے جس سے دل کانپ اٹھتے ہیں اور نظریں دہشت کے مارے جھک جاتی ہیں: زمین کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی! صاحب جبروت اور صاحب کبریائی و عظمت خدا تختِ عدالت پر جلوہ افروز ہوگا! وہی سارے معاملات کا فیصلہ فرمائے گا! فرشتے صف بہ صف اس کے حضور ایستادہ ہوں گے! اور جہنم قریب لائی جائے گی، جو مجرمین کی تعذیب کے لیے بالکل تیار ہوگی!

يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ (۲۳) اس دن انسان کو سمجھ آئے گی۔

اس انسان کو جو خدا کی بخشش اور عدم بخشش کے سلسلے میں اس کی آزمایش کی حکمت سے غافل تھا، جس نے میراث کا مال سمیٹ کر ہڑپ کر لیا تھا، جو دولت کی محبت میں گرفتار تھا، جس نے یتیم کی عزت و خاطر داری نہیں کی تھی، جس نے غریب کے کھلانے پلانے پر لوگوں کو ابھارا نہیں تھا، اور جس نے ظلم و سرکشی کرنے، فساد پھیلانے اور حق سے منہ موڑنے کی روش اختیار کی تھی۔ ہاں، اس انسان کو سمجھ آجائے گی، وہ حق کو جان لے گا، اور جو کچھ دیکھے گا اس سے نصیحت حاصل کرے گا۔ لیکن اب

وقت گزر چکا۔

وَاَنّٰی لَہُ الذِّکْرٰی (۲۳) مگر اب سمجھ میں آنے کا کیا حاصل ۔
نصیحت حاصل کرنے کا وقت گزر چکا! دار جزا میں نصیحت حاصل کرنے سے کسی کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ ہاں ' وہ اس بات پر ضرور حسرت کرے گا کہ دنیا کے دار العمل میں اسے جو فرصت تھی وہ اس نے کھو دی۔ اور بس! جب اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی تو
یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ (۲۴) وہ کہے گا ' اے کاش ' میں نے اپنی زندگی کے لیے کچھ کر کے آگے بھیجا ہوتا۔
آخرت کی زندگی ہی وہ حقیقی زندگی ہے جس کے لیے "حیات" کا لفظ موزوں اور زیبا ہے۔ اور یہی اس قابل ہے کہ انسان اس کے لیے تیاری کرے اور اس کے لیے پیشگی جدوجہد اور عمل کا ذخیرہ کرے۔ یٰلَیْتَنِیْ ' اے کاش ! ایک تمنا ہے جس میں حسرت کا پہلو واضح و نمایاں ہے۔ اور یہی وہ زیادہ سے زیادہ شے ہے جو آخرت میں انسان کے بس میں ہو گی۔

اس دردناک حسرت اور اس بے فائدہ تمنا کے بعد ' قرآن ان کے انجام کی اس طرح تصویر کشی کرتا ہے:
فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُعَذِّبُ عَذَابَہٗٓ اَحَدٌ ، وَّلَا یُوْثِقُ وَثَاقَہٗٓ اَحَدٌ ، (۲۵-۲۶) اس دن اللہ جو عذاب دے گا ویسا عذاب کوئی نہیں دے سکتا ' اور جس طرح وہ (مجرمین کو) جکڑے گا ویسا کوئی نہیں جکڑ سکتا۔
وہ اللہ ہے ' قہار و جبار! وہ مجرمین کو ایسا انوکھا اور منفرد عذاب دے گا جس طرح کا عذاب دینا کسی کے بس میں نہیں ہے ' اور سرکشوں کو اس طرح جکڑ بند کرے گا کہ اس جیسا جکڑ بند کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔
اللہ تعالٰی سرکشوں کو کیا اور کیسا عذاب دے گا ' اور مجرموں کو کس طرح قید کرے گا اور باندھے اور جکڑے گا ' اس کی تفصیل قرآن مجید میں قیامت کے بہت سے متنوع مناظر میں دوسرے مقامات پر موجود ہے۔ یہاں قرآن مجید صرف اتنا بیان کرتا ہے کہ خدا کا عذاب منفرد قسم کا ہو گا ' جس کی کوئی نظیر انسانی تعذیب میں نہیں ہے۔ وہ مجرموں کو جس طرح جکڑے اور باندھے گا ' اس کی بھی کوئی مثال انسانی قید و بند میں نہیں ہے۔ خدا کا عذاب اور اس کی قید و بند تمام مخلوقات کے عذاب اور ان کی قید و بند سے زیادہ شدید ہے۔

یہاں مجرموں کی قید و بند اور ان کی تعذیب کا ذکر عاد و ثمود اور فرعون کے ظلم ' سرکشی اور زمین میں ان کے فساد پھیلانے کے مقابلے میں ہے۔ اس ظلم و فساد کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ لوگوں کو سخت سزائیں دیتے اور انھیں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑتے تھے۔ تو اے نبی ' اور اے مرد مومن ' تمھارا رب ان تمام لوگوں کو پابند سلاسل کرے گا اور عذاب دے گا جو لوگوں کو قید و بند میں مبتلا کرتے اور عذاب دیتے ہیں۔ لیکن کہاں یہ قید و بند اور کہاں وہ قید و بند! کہاں یہ عذاب اور کہاں وہ عذاب! مخلوق قید و بند اور تعذیب کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتی ہے وہ بہت ہلکا ہے ' کائنات کا خالق و فرماں روا قید و بند اور تعذیب کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہے وہ بہت ہولناک ہے۔ جو افراد انسانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں ' ان کی قید و بند اور ان کی تعذیب کے سلسلے میں وہ سب کچھ ہو گا جو ہونا چاہیے۔ ہاں! ہاں! ان کو اس طرح جکڑا اور باندھا جائے گا اور ان کو ایسا ایسا عذاب دیا جائے گا کہ انسانی خیال و گمان کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

اس ہیبت ناک ' پُرہول منظر اور قید و بند اور عذاب کے ــ جو ہر گمان اور ہر تصور سے بڑھ کر ہو گا ــ درمیان ملاء اعلیٰ سے مرد مومن کو ندا آتی ہے:

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ، ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ، فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ، وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ (۲۷-۳۰)

اے مطمئن جان ' اپنے رب کے پاس لوٹ آ: تو اس سے راضی ' وہ تجھ سے راضی۔ آ' میرے بندوں میں شامل ہو جا' میری جنت میں داخل ہو جا۔

یاایتھا ' کس قدر شفقت اور قرب ہے! یاایتھا النفس ' اے جان ' کس قدر روحانیت اور اعزاز و اکرام ہے! یاایتھا النفس المطمئنۃ ' اے مطمئن جان ' کس قدر تعریف اور سکون بخشی ہے!

ارجعی الی ربک ' اپنے رب کی طرف لوٹ آ' قید و بند کی اس فضا کے بیچ کس قدر آزادی و نرمی ہے! ہاں ' زمین سے اپنے سفر اور اپنے گہوارے سے اپنی جدائی کے بعد ' اس ہستی کی طرف لوٹ آ۔ جہاں سے تیری زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

راضیۃ مرضیۃ ' تو اس سے خوش ' وہ تجھ سے خوش۔ لوٹ آ اپنے رب کے پاس ' اس تعلق ' معرفت اور نسبت کے ساتھ جو تیرے اور تیرے خدا کے مابین ہے۔

فادخلی فی عبدی ' آ' میرے بندوں میں شامل ہو جا۔ یعنی میرے مقرب بندوں میں شامل ہو جا

تا کہ قربِ الٰہی حاصل ہو۔ کتنی خنکی و شیرینی ہے جو پوری فضا کو محبت اور رضا و خوشنودی سے بھر دیتی ہے۔

وادخلی جنتی ' اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ میری آغوش رحمت میں آجا۔

اس محبت و شفقت میں ' جو ان آیات میں ہے ' جنت کی ہوائیں آغاز ہی سے چل رہی ہیں: یایتھا النفس المطمئنۃ ' اے مطمئن جان ' کی ندا سے آغاز ہوتا ہے۔ مطمئن جان ' وہ جان جو اپنے رب سے مطمئن ہے ' جو اس کے راستے سے مطمئن ہے ' جو اللہ کی قضا و قدر سے جو اس کے سلسلے میں ہے مطمئن ہے ' جو راحت و مصیبت ' رزق کی فراخی و تنگی ' خدا کے دینے اور نہ دینے ' ہر حال میں مطمئن ہے۔ مطمئن ہے ' اس لیے شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوتی۔ مطمئن ہے ' اس لیے راہ راست سے منحرف نہیں ہوتی۔ مطمئن ہے ' اس لیے راستے میں ٹھٹھک کر کھڑی نہیں ہوتی۔ مطمئن ہے ' تو قیامت کے ہولناک اور پُر خوف دن میں ہراساں اور خائف نہیں ہوتی۔

یہ آغاز ہے ' یہ ندا ہے --- اس کے بعد جو آیات آتی ہیں ان سے ساری فضا امن ' رضا و خوشنودی اور طمانیت سے بھر جاتی ہے۔ ساتھ ہی آیات کا خنک اور نرم رو ترنم محبت ' قرب اور سکینت کی لہریں بکھیرتا ہے۔

ہاں یہ جنت ہے! یہ اپنے خنک اور خوشگوار انفاس کے ساتھ ان آیات کے بیچ سے جھلکتی ہے ' اور خدائے رحمٰن کی بزرگ اور حسین و جمیل تجلیات اس پر اپنے انوار بکھیر رہی ہیں۔

(فی ظلال القرآن ' ترجمہ: سید حامد علی ' تدوین: خرم مراد)

۲۴ گھنٹے ہر ایک کو ہر روز ملتے ہیں
آپ اس کا کچھ حصہ مطالعہ میں ضرور صرف کیجیے

○

کیا پڑھیں کیا نہ پڑھیں — خود اپنا فیصلہ کیجیے

راستے میں آئی ہر چیز کو وقت گزاری کے لیے نہ پڑھنے لگ جایئے

وقت کی اصل قیمت ہے — یہی اصل نعمت ہے

اس کا جواب دینا ہے

پڑھنے کے لیے بہت کچھ ہے — آپ سب کچھ نہیں پڑھ سکتے

صرف اچھی کتابیں، اچھے رسالے پڑھیے

○

اپنے وقت پر بہترین مطالعہ کی سرمایہ کاری کیجیے

اعلیٰ بیج ڈالیے — اعلیٰ فصل لیجیے

اس جہاد میں بھی ! اس جہاد میں بھی ! !

(بندہ خدا)

تحریکِ اسلامی : کارکنوں کے اوصاف

پروفیسر غلام اعظم

تحریک اسلامی دنیا کے جس گوشے میں بھی سرگرم کار ہے' اس کی دعوت و تربیت کے لائحہ عمل کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ؐ ہے۔ اس لیے حالات و کیفیات کے فرق کے باوجود ایک مقام کے راہ نما کے جذبات سے ہر مقام کے لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ پروفیسر غلام اعظم ہمارے قارئین کے لیے ایک معروف و محبوب شخصیت ہیں۔ آج کل وہ بنگلہ دیش میں ہیں' مگر اس سے پہلے پاکستان میں وہ تحریک اسلامی کے قائد رہے ہیں' اور اپنے دامن میں وسیع تجربات رکھتے ہیں۔ ہم ان کی ایک بنگلہ تحریر کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جس میں انھوں نے جامع انداز میں کارکنوں کے مطلوبہ اوصاف کی نشان دہی کی ہے۔ انداز بیان 'کتابی نہیں' عملی ہے۔ (مدیر)

جو افراد کسی جماعت میں اس مقصد سے شامل ہو کر سرگرمِ عمل ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اسی کے دین کو غالب کریں گے' شیطان ان کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ کیونکہ شیطان کی حکومت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے کی صلاحیت یہی لوگ رکھتے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا قانون جاری کرنے میں کامیاب ہو جائیں' تو پھر شیطان کی حکومت مغلوب ہو جاتی ہے۔

ویسے تو شیطان ہر صاحبِ ایمان کو گمراہ کرنے اور اسے عملِ صالح سے باز رکھنے کے لیے کوشاں رہتا ہے' تاہم محض ایمان کے اقرار اور رسمی عملِ صالح سے اسے کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے ایمان والوں اور نیکوکاروں سے ناراض تو ہوتا ہے مگر شدید دشمنی نہیں کرتا' کیونکہ وہ شیطان کی فرماں روائی کے خلاف بغاوت کرنے والے نہیں ہوتے۔

اس لیے تحریک اسلامی کے ہر کارکن کو شیطان اپنا بدترین دشمن تصور کرتا ہے۔ وہ انھیں دین کے لیے جہاد کی راہ سے ہٹانے کے لیے نئی نئی سازشیں اور طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ اگر ہٹا نہ سکے تو کم از کم ان کی نیت میں ملاوٹ اور ان کے باہمی تعلقات میں بگاڑ' غلط فہمیاں اور افتراق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو انسان شیطان کے چیلے ہوتے ہیں وہ بھی کارکنوں کو دنیا کا لالچ دے کر یا باطل قوتوں سے ڈرا دھمکا کر سیدھی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے شیطان اور اس

کے شاگردوں کو اپنا دشمن سمجھنا اور ان کی سازشوں، ہتھکنڈوں اور فریب کاریوں سے بچنے کے لیے ہوشیار اور چوکنا رہنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا، یعنی شیطان تمھارا دشمن ہے، اس کو دشمن ہی سمجھنا۔ (فاطر ۳۵: ۶) حضرت آدم علیہ السلام نہ شیطان سے دھوکہ کھاتے، اور نہ اس کا وہ مشورہ قبول کرتے جو اس نے خیرخواہ بن کر دیا تھا، اگر وہ اپنے دشمن کو پہچان لیتے۔ کوئی عقلمند آدمی اپنے دشمن کا مشورہ قبول نہیں کرتا۔ اس لیے خدا کے حکم کی خلاف ورزی، اور جہاد فی سبیل اللہ سے باز رکھنے کے لیے کوئی کتنی ہی "میٹھی نصیحت" کرے اور کتنا ہی "نیک مشورہ" دے، خبردار رہنا چاہیے کہ وہ سراسر شیطان کا دھوکہ اور وسوسہ ہے۔

تحریک اسلامی کے کارکن اگر خدا کی راہ میں جمے رہنا چاہتے ہیں، تو انھیں ہروقت اور ہرحالت میں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کی راہ پر آجانے کی سعادت ملنا بڑی خوش نصیبی ہے۔ اس لیے ان کی نیت اور مقصد کے اخلاص میں کوئی ملاوٹ نہیں ہونا چاہیے۔ انھیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ تحریکِ اسلامی میں شامل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ جان و مال کی کیسی قربانی کا مطالبہ کرتے ہیں، اور اس راہ پر گامزن رہنے کے لیے کن اوصاف اور خصوصیات سے مزین ہونا ضروری ہے۔

ان اوصاف کے سلسلے میں ہم سات نکات پر گفتگو کریں گے۔ ہر نکتے کا عنوان قرآن حکیم سے لیا گیا ہے۔

نکتہ اول : الحمد لِلّٰہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے بلیغ ترین جملہ ہے۔ اس کی تعلیم خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "تمام تعریف صرف اللہ کے لیے ہے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: الحمد راس الشکر ماشکر اللہ عبد لایحمدہ، الحمدللہ شکر کی اصل ہے۔ جس بندے نے اللہ کی تعریف نہ کی اس نے اس کا شکر بھی ادا نہ کیا (المشکوٰۃ)۔

ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں ہمیں بیشمار نعمتیں بخشی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے لیے کائنات میں جو نعمتیں ہیں، قرآن کریم کے اندر بار بار آنے والی تصریحات کے مطابق وہ بے حد و حساب ہیں۔ لیکن ان سب نعمتوں میں ایک نعمت ایسی ہے جو بے مثال ہے۔ دوسری تمام نعمتیں مل کر بھی اس کے برابر نہیں ہوسکتیں۔ وہ نعمت، اللہ کا دین، اسلام ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جس کے ذریعے دنیا میں سلامتی اور آخرت میں نجات مل سکتی ہے۔

قرآن مجید کی ایک سورہ کا نام "الرحمٰن" ہے۔ الرحمن کا مطلب ہے تمام اور لامتناہی مہربانیوں، رحمتوں اور شفقتوں کا سرچشمہ۔ اس سورہ کے شروع ہی میں فرمایا گیا ہے: اَلرَّحْمٰنُ،

عَلَّمَ الْقُرْآنَ ' یہ الرحمن ہے جس نے قرآن سکھایا۔ گویا قرآن ' الرحمن کی بے انتہا رحمتوں کا ظہور ہے۔ اسی قرآن میں وہ تعلیمات ہیں جن کی بنیاد پر رسول اللہ ؐ نے اسلام کا مکمل ضابطۂ حیات نافذ کیا۔ اس طرح اسلام ہی اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

تحریکِ اسلامی میں شمولیت اختیار کرنے کی سعادت جنھیں نصیب ہوئی ہے ان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ اس خوش نصیبی پر اپنے خدا کا شکر ادا کریں۔ اس تحریک میں شامل ہونے سے پہلے ہم اسلام کو صرف ایک مذہب سمجھتے تھے۔ ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں صرف اللہ کو اپنا حاکم تسلیم کرنا چاہیے' اور اس کے رسول ؐ کو ہی قائد مان کر صرف اسی کے طریقے کا اتباع کرنا چاہیے۔ ہم نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کو مذہبی رسوم سمجھتے تھے اور ان کی حقیقت سے ناواقف تھے۔ ہم نے اس طرح کی انقلابی باتیں نہ سنی تھیں کہ اسلامی ریاست اور حکومت کے قیام اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی کوشش کرنا مومنین کا سب سے بڑا اور اہم ترین فرض ہے' اور یہ کہ اس مقصد کی خاطر کسی اسلامی تنظیم میں شامل ہو کر کام کرنا ناگزیر ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اسلامی قوانین انسانی قوانین کے ماتحت رہنے کے لیے نہیں آئے ہیں' بلکہ اسلام کو تمام دوسرے مذاہب و قوانین اور نظام ہائے زندگی پر غالب کر دینے کے لیے ہی رسول اللہ ؐ کو بھیجا گیا ہے۔

ہم اس لذتِ ایمان پر جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے جو تحریکِ اسلامی میں شامل ہونے کے بعد ہمیں حاصل ہوئی۔ اس بنا پر ہمارا نکتہ اوّل یہی ہے کہ زندگی بھر الحمدللہ ' الحمدللہ پکارتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملِ حال نہ ہو تو کسی کو ہدایت نہیں مل سکتی۔ وہ توفیق بخشے' تب ہی یہ ممکن ہے کہ آدمی دین کی راہ پر گامزن ہو۔ یہ حقیقت اگر ہمیشہ یاد رہے' تو جذبہ شکر ہمیشہ تازہ رہ سکتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت ملنے پر شکر ادا کرنے کا جذبہ صرف دنیوی زندگی تک محدود نہیں رہتا بلکہ مومن بندے اس وقت بھی اللہ کا شکر ادا کریں گے جب وہ بہشت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ' بہشت کے باشندے کہیں گے تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم کو یہ ہدایت دی۔ اگر اللہ ہدایت نہ دیتا تو ہمیں ہدایت ہرگز نصیب نہ ہوتی۔ (الاعراف ۷: ۴۳) بہشت کی نعمتوں سے نوازے جانے والے ڈھٹائی سے یہ نہ کہیں گے کہ ہم اپنے نیک اعمال کے نتیجہ میں ان نعمتوں سے ہمکنار ہوئے ہیں' بلکہ وہ اعتراف کریں گے کہ ان نعمتوں کا حصول محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم ہی سے ممکن ہوا ہے۔ اس لیے حصول ہدایت پر بطور شکر ' الحمدللہ کا ورد کرنا ضروری ہے۔ یہ تسبیح اگر ہر نماز کے بعد گہرے جذبۂ شکر کے ساتھ' تہہ دل سے اور آسودگی قلب سے' پڑھی جائے تو مزید سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

ہمیشہ شکر ادا کرنے کے کام کو آسان کرنے کے لیے رسول اللہ ؐ نے بہت سی ایسی دعائیں سکھائی ہیں جو الحمدللہ سے شروع ہوتی ہیں۔ صبح جاگنے پر الحمدللہ ' حوائج ضروریہ سے فراغت پر الحمدللہ ' کھانے پینے کے بعد الحمدللہ ' کپڑے پہنتے ہوئے الحمدللہ ' آئینہ دیکھ کر الحمدللہ ' سواری پر بیٹھتے ہوئے الحمدللہ ' گویا ہر لمحہ ' ہر قدم پر الحمدللہ۔

نکتہ دوم : رضوان اللہ

قرآن کریم میں رضوان اللہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کے معنی میں ہوا ہے۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے یہ نکتہ بہت ہی اہم ہے۔

اللہ تعالیٰ آدمی کو اس کے کام کا جو اجر و ثواب بھی دیں گے ' یہ جانچنے کے بعد ہی دیں گے کہ اس نے کس نیت سے وہ کام کیا ہے۔ اگر نیت صحیح نہ ہو تو اچھے سے اچھے نیک کام پر بھی انعام نہ ملے گا۔ رسول اللہ ؐ نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے: انما الاعمال بالنیات ' بے شک نیت ہی اعمال کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی کے ہر کارکن کو اپنا دل اچھی طرح ٹٹول لینا چاہیے کہ میں کس نیت سے اور کس غرض سے اس راہ پر آیا ہوں۔ کیا میں یہاں اپنا کوئی مفاد حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں؟ کسی دنیوی فائدے کے لالچ میں تو میں نے شمولیت اختیار نہیں کی؟ اگر ایسے کسی فائدے یا لالچ کا سراغ مل جائے تو پھر اس سے پوری طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہیے۔ کیونکہ غلط نیت کے ساتھ ' نہ صرف یہ کہ تمام اعمال اکارت جائیں گے بلکہ ' اس تحریک میں ٹھہرنا بھی محال ہو گا۔ تحریک اسلامی میں جو شامل ہو ' صرف اس امید پر ہی شامل ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیوی فائدوں اور آسایشوں کی مقدار بھی محدود ہے ' قیمت بھی کچھ نہیں ' کہ ان کو ختم ہی ہو جانا ہے۔ جو لوگ انھی کو مقصد اصلی سمجھتے ہیں ' ان کے ہاں خدا کی خوشنودی و رضامندی کی اہمیت نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن آخرت کی زندگی میں آرام و آسایش کی نعمتیں عظیم بھی ہیں اور ہمیشہ باقی رہنے والی بھی۔ نہ نعمتیں ختم ہوں گی ' نہ موت آئے گی۔ جو لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں ' وہ رضوان اللہ (اللہ کی رضامندی) کی ضرورت اور قیمت سے خوب آشنا ہیں۔ ہم میں جو قبر ' حشر اور جہنم کے عذاب سے نجات حاصل کرنے اور بہشت کی آسایشوں سے متمتع ہونے کے خواہاں ہیں ' انھیں اللہ کی خوشنودی کے سوا چارہ نہیں ' کیونکہ اللہ کی خوشنودی کے بغیر یہ مقاصد حاصل نہیں ہو سکتے۔

قرآن اور اسوۂ رسول ؐ و صحابہ ؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ کی زمین پر انسان کا خود ساختہ قانون غالب ہو ' تو وہاں صرف نماز روزہ سے اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہوتا۔ یہ بات ایمان کے قطعاً منافی

ہے کہ آدمی قانونِ الٰہی کے نفاذ کے لیے جہاد سے بچنے کی خاطر باطل کے ساتھ مصالحت کرے۔ رسول اللہ ؐ کے مبارک دور میں وہی لوگ منافق کہلائے جو نماز' روزہ تو ادا کرتے تھے مگر باطل سے لڑائی مول لینے سے گریز کرتے تھے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی حاصل کرنے کی خاطر تحریکِ اقامت دین میں سرگرم عمل رہیں۔

سورہ آلِ عمران (۳:۱۷۲' ۱۷۴) میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب رسول اللہ ؐ نے مسلمانوں کو' غزوہ احد میں شکست کے فوراً بعد' دشمنوں پر دوبارہ حملہ کرنے کی دعوت دی تو منافقین نے انھیں یہ کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی کہ دشمن نے ایک بہت بڑی فوج جمع کر لی ہے۔ یہ سن کر مجاہدینِ اسلام کی صف میں دہشت پھیلنے کی بجائے ان کے ایمان اور عزم و استقامت میں اضافہ ہوا اور وہ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس جنگ میں شکست کے خسارے سے بچ گئے' اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور مہربانی سے فیض یاب ہو کر سلامتی کے ساتھ واپس آگئے' اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی راہ پر چلنے کی سعادت سے بھی سرفراز ہوئے۔ و اتبعوا رضوان اللّٰہ۔

نکتہ سوم : بیعت باللہ

بیعت' کے معنی ہیں بیچنا' بیعت باللہ کے معنی ہوئے اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں فروخت کرنا۔ ایمان کے معنی ہی بیعت باللہ ہیں' یعنی اپنی جان و مال کو جنت کی قیمت کے عوض اللہ کے ہاتھ بیچ دینا۔ اگر ہم تحریک اسلامی میں اپنا فریضہ خلوص اور تن دہی کے ساتھ ٹھیک ٹھیک انجام دینا چاہیں' تو ہم پر لازم ہے کہ اس معاہدۂ فروخت کے مطابق اپنی جان و مال تحریک کے کام میں لگائیں: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ 'حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں سے ان کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے (التوبہ ۹:۱۱۱)۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہوا کہ بہشت حاصل کرنا ہو تو ہمیں یہ سمجھتے ہوئے اپنی زندگی گزارنا ہوگی کہ ہمارے جان و مال ہمارے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ اگر ہم اپنے جان و مال کو اپنی من مانی خواہشات کے مطابق صرف کریں تو بہشت ملنے کی امید نہیں ہو سکتی۔

ممکن ہے کہ ہم مطمئن رہیں کہ اللہ سے اپنا معاہدہ بیع پورا کر رہے ہیں' لیکن جان و مال کو اللہ کی راہ میں فی الواقع دے دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ ایک طرف سے نفس آدمی کو دھوکہ دیتا ہے' دوسری طرف سے شیطان وسوسہ ڈالتا رہتا ہے' پھر اہل و عیال اور اقارب کی طرف سے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ ان عوامل کی وجہ سے اللہ کی مرضی کے مطابق اس کی راہ میں چلنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ اللہ کو فروخت کیے ہوئے جان و مال کو اللہ کی راہ میں دینے' اور ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری

ہے کہ آدمی کسی اسلامی تنظیم میں شامل ہو جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کے لیے بنی ہو۔ گویا' دوسرے الفاظ میں 'تنظیم کے ہاتھ پر "بیعت" کرے۔ تنظیم میں شمولیت کے وقت آدمی جو حلف لیتا ہے' وہ اسی "بیعت" کی ایک صورت ہے۔ اس کے معنی ہیں: میرے وہ جان و مال' جنھیں میں ایمان لاتے ہی اللہ کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہوں' اگر انھیں اپنے قبضہ میں رکھ کر اللہ کی راہ میں صرف کرنا چاہوں تو نفس کے دھوکے' شیطان کے وسوسے اور گھر والوں اور رشتہ داروں کے دباؤ سے مجبور ہو کر اللہ کی مرضی کے مطابق صرف نہ کر سکوں گا' اسی لیے میں تنظیم کو اختیار سپرد کر رہا ہوں کہ وہ میرے جان و مال کو اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنے میں میری مدد کرے۔ میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ تنظیم شریعت اور دستور کے مطابق جو فیصلے کرے گی انھیں تسلیم کروں گا۔

حقیقت یہ ہے کہ تنظیم کے ساتھ بیعت کے بغیر اللہ کے ساتھ 'بیع' کرنے کے تقاضے مکمل طور پر پورے نہیں ہو سکتے۔

جذبہ شہادت

بیعت باللہ' اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے کے جذبے' یعنی جذبہ شہادت کا اظہار بھی ہے: اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ "میری نماز' میری تمام عبادتیں' اور میری زندگی اور موت سب کے سب اللہ رب العالمین کے لیے ہیں (الانعام ۶: ۱۶۲)۔ یہ آیت اس جذبہ شہادت کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔

ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم' اقامت دین کی راہ میں' جذبہ شہادت لیے ہوئے اپنی ذمہ داری نبھاتے رہیں۔ رہی یہ بات کہ مجھ سے کس قدر اور کس طرح قربانی لی جائے گی' تو یہ سراسر میرے مولائے لایزل کے ارادوں پر منحصر ہے۔ یہ بالکل انھی کی مرضی سے طے ہوتا ہے کہ وہ مجھے اہل باطل کے ہاتھوں قتل کروا کے شہادت کا درجہ عطا فرمائیں گے جو نسبتاً آسان تر کام ہے' یا اسلام کا غلبہ نصیب کر کے اللہ کا قانون جاری و ساری کرنے کی ذمہ داری میرے اوپر عائد کریں گے جو نسبتاً دشوار تر کام ہے۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ پورے اطمینان اور خاطر جمعی کے ساتھ لگا رہوں اور دونوں طرح کے انجام کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہوں۔

غزوۂ احد میں ۷۰ صحابہ شہید ہوئے اور غزوۂ بدر کی شاندار کامیابی کے مقابلے میں اس کو شکست شمار کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: آج اگر تم پر چوٹ آئی ہے تو دشمنوں پر بھی (بدر میں) ایسی ہی چوٹ آئی تھی۔ یہ صرف گردش زمانہ ہے جسے ہم لوگوں میں گھماتے رہتے ہیں' تاکہ اللہ دیکھ لے کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور تاکہ تم میں سے کچھ لوگوں کو شہادت کا درجہ دے' حقیقت یہ ہے کہ اللہ

ظالموں کو پسند نہیں کرتے (آل عمران ۳: ۱۴۰)۔

معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں کو شہادت کی سعادت عطا کرنا خود اللہ تعالیٰ کے منصوبے میں شامل ہے۔ اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ مستقبل کی اس ذمہ داری کو ملحوظ رکھتے ہوئے خطرات سے دامن بچا کر چلا جائے۔ آج بھی جو لوگ تحریک اسلامی میں شامل ہو کر شہید ہو رہے ہیں، خود اللہ تعالیٰ ہی نے اس کے لیے ان کا انتخاب فرمایا ہے۔ یہ دیکھ کر ڈر جانا اور ڈر کر پیچھے ہٹنا کہ باطل کے ساتھ لڑائی چل رہی ہے، بیعت باللہ کے تقاضے کے خلاف ہو گا۔ مگر اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ کسی منصوبہ بندی اور اجتماعی فیصلہ کے بغیر، صرف شہید ہونے کے شوق میں، دشمن کو اپنی جان سپرد کر دینا کوئی صحیح اور معقول جذبہ نہیں۔ البتہ جو یہ خواہش رکھتے ہیں کہ آخرت میں ان کو شہادت کا رتبہ بلند حاصل ہو، ان کو رسول اللہ ؐ نے بشارت دی ہے کہ شہادت کا جذبہ لے کر اللہ کی راہ میں آنتھک جہاد کرنے والے کو اگر گھر میں چارپائی پر بھی موت آئے تب بھی اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کو شہدا میں شمار کریں گے۔

باقی چار نکات

الحمدللہ، رضوان اللہ اور بیعت باللہ وہ صفات ہیں جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کو اللہ کی راہ پر گامزن رکھنے میں موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ تاہم یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس راہ پر چلنے سے آدمی دنیا میں دینی حیثیت سے کتنی ترقی حاصل کر سکے گا؟ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان صرف فائدہ اور کامیابی ہی کی امید پر، اپنی محنت، وقت، مال، جذبہ اور ذہنی استعداد صرف کرتا ہے۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں کو کامیابی کا حساب دو پیمانوں سے کرنا چاہیے۔ ایک اس کی ذاتی کامیابی، دوسرے تحریک اور تنظیم کی اجتماعی کامیابی۔ تحریک کی کامیابی تو خود دین کے غلبہ اور اسلامی حکومت کے قیام پر منحصر ہے، مگر کارکن کی ذاتی کامیابی تحریک کی کامیابی پر موقوف نہیں ہے۔ کارکن کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر چار خصوصیات پیدا کرے۔ یہ چار خصوصیات اور اوصاف ایسے ہیں جنھیں خود اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے پسند فرمایا ہے۔ یہ اوصاف تحریک اسلامی کی سرگرمیوں کے ذریعے پیدا ہو سکتے ہیں۔

نکتہ چہارم : عباد اللہ

عباد اللہ کے معنی ہیں اللہ کے بندے۔ بندے کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے مولا کے حکم کی پابندی کرے۔ تحریک اسلامی نے اپنے کارکنوں کے لیے جو پروگرام تجویز کیا ہے وہ اللہ کا غلام اور بندہ بننے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ جو لوگ اس پروگرام کی پابندی کرتے ہیں صرف وہی حقیقی معنوں

میں کارکن ہیں۔ اس پروگرام کے تحت ہفتے میں دو قسم کے کام کیے جاتے ہیں اور اس کی رپورٹ نظم کو دی جاتی ہے۔ پہلی قسم کے کام اپنے آپ کو اللہ کا حقیقی بندہ بنانے سے متعلق ہیں ' اور دوسری قسم کے کام دوسروں کو اس تحریک میں شامل کرنے کی کوششوں سے متعلق ہیں۔

اللہ کا بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ دین کا علم حاصل کیا جائے ' اور جتنا جتنا علم حاصل ہوتا جائے اس کے مطابق عمل کیا جاتا رہے۔ اس مقصد کے لیے روزانہ قرآن کی چند آیات سمجھ کر پڑھنا ' کم از کم ایک حدیث سیکھنا ' کسی اسلامی کتاب سے کم از کم دس صفحات پڑھنا اور باجماعت نماز پڑھنا کارکنوں کے لیے لازمی ہے۔ ہفتہ وار اجتماعات میں مزید تعلیم و تربیت کے مواقع ملتے ہیں۔ صحت کے ساتھ قرآن پڑھنے اور فقہی مسائل سیکھنے پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ باقاعدہ تربیتی پروگرام بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ذمہ داریوں پر فائز کارکنوں کے لیے خصوصی تربیت کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔

عباد اللہ کا رتبہ حقیقتاً حاصل کرنا ہو تو یہ پختہ عزم کرنا ہو گا کہ میں نفس کی غلامی ہرگز نہیں کروں گا۔ نفس مطالبہ کرتا رہتا ہے کہ آدمی دنیا کی ساری لذتوں سے متمتع ہو۔ مگر روح اور ضمیر جسم کے بُرے اور ناجائز مطالبات پر احتجاج کرتے رہتے ہیں۔ اچھی اور بُری باتیں ہر انسان کو معلوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب نفس بُرے کام کا حکم دیتا ہے تو ضمیر اس پر اعتراض کرتا ہے۔ نفس اگر غالب آجائے تو انسان ضمیر کے اعتراض کے باوجود نفس کی خواہشات اور مطالبات کے مطابق کام کر گزرتا ہے۔ نفس کی بندگی سے بچنے اور اللہ کی حقیقی بندگی اختیار کرنے کے لیے تین کام ضروری ہیں:

(۱) یہ عزم کرنا کہ روح کے تقاضوں کے خلاف ہرگز نہ چلوں گا ' اور نفس کو اپنا مولا نہ بننے دوں گا۔

(۲) روح کو نفس پر غالب رکھنے کے لیے باقاعدگی کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنا ' رمضان میں فرض اور ہر مہینہ دو یا تین نفلی روزے رکھنا ' مال خرچ کرنا ' اور رات میں تہجد کی نماز پڑھنا۔

(۳) ہمیشہ اپنا احتساب کرنا کہ نفس کو غلبہ حاصل نہ ہونے پائے۔ اگر کبھی نفس غالب آجائے تو فوراً توبہ کر کے اور مجاہدہ کر کے اس کو شکست دینا۔

نکتہ پنجم : اولیاء اللہ

اولیا ولی کی جمع ہے۔ ولی کے معنی ہیں مددگار ' دوست ' سرپرست ' نگہبان ' تائید کرنے والا وغیرہ۔ لفظ ولی کا اطلاق اللہ پر بھی ہوتا ہے اور بندے پر بھی۔

لفظ ولی کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ہونے کی مثال: اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اللہ تعالیٰ مومنوں کا ولی ہے (البقرہ ۲: ۲۵۷)۔ اور لفظ ولی کا اطلاق بندوں پر ہونے کی مثال: اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ

وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ' آگاہ رہو اللہ کے ولیوں کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ مایوسی (یونس ۱۰: ۶۲)۔

جب اس لفظ کا اطلاق اللہ پر ہو تو اس کے معنی ہیں سرپرست اور مددگار۔ اور جب اللہ کے بندوں پر ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں اللہ کے پیارے دوست۔ اگر کسی انسان کو اللہ کا ولی کہا جائے تو اس کو اللہ کا نہایت پیارا دوست سمجھا جائے گا۔ صرف عام بندہ نہیں۔

اللہ کے ولی کی چند خصوصیات یہ ہیں:

(۱) وہ اللہ کا حکم محبت سے بجالاتے ہیں۔ محبت کی بنا پر جو پابندی کی جاتی ہے' اس کا نام احسان ہے۔ (ملاحظہ ہو: سید ابوالاعلیٰ مودودی' تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں) صرف سزا کے خوف سے اگر کوئی کام کیا جائے تو وہ کام پُرلطف نہیں ہوتا جتنا کہ وہی کام محبت کے ساتھ کیا جائے تو ہوتا ہے۔

(۲) وہ حتی الامکان کسی حالت میں بھی اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے۔ اللہ کا حکم دو قسم کا ہوتا ہے: ایک امر اور دوسرا نہی۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کرنے کا حکم دیا ہے ان سب کو کرنا اگر ممکن نہ بھی ہو' تب بھی جن چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے ان سے پرہیز کیا جاسکتا ہے۔ اللہ کے ولی اس معاملے میں بہت فکرمند رہتے ہیں کہ ان سے ایسا کام صادر نہ ہونے پائے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو۔ اللہ تعالیٰ سے خالص اور گہری محبت یہ صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے کہ "ان کا کان میرا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتے ہیں' ان کی آنکھ میری آنکھ بن جاتی ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں' ان کا ہاتھ میرا ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ پکڑتے ہیں' اور ان کا پیر میرا پیر ہو جاتا ہے جس سے وہ چلتے ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے اعضا و جوارح کو کبھی ایسے کسی کام میں استعمال نہیں کرتے جو اللہ کو پسند نہیں۔

(۳) ہر حالت میں اللہ سے راضی اور خوش رہتے ہیں۔ دنیا میں آفات و مصائب' تکلیف اور اذیت' المیے اور سانحے اور رنج و غم ہر کسی کو کم و بیش پیش آتے رہتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام تک اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اللہ کے ولی کو اللہ سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان مصائب میں ان کے لیے ضرور کوئی بھلائی ہے۔ آفات و مصائب اللہ ہی کے ارادے سے آتے ہیں اور وہ سب کچھ بندے کی بھلائی کے لیے نازل کرتے ہیں۔ اس یقین کی وجہ سے اللہ کے ولی کسی سخت سے سخت حالت میں بھی نہ تو گھبراتے ہیں اور نہ پریشانی اور مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر غیر متزلزل اعتماد اور توکل اور اللہ کے ارادوں پر مکمل بھروسہ رکھنے کی وجہ سے ان کے دل کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر حالت میں وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ کہہ کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں۔

تحریک اسلامی کے کارکنوں کے روز مرہ کے پروگرام کا ایک اہم جزو محاسبۂ نفس ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ عقل مند وہ ہے جو اپنے نفس کی تنقید اور مواخذہ خود ہی کر لے۔ یہی وہ کام ہے جو بندے کو ولایت کے مرتبے پر فائز ہونے میں مدد دیتا ہے۔ کارکن کو چاہیے کہ وہ انھی تین باتوں پر اپنا محاسبہ کرے جن کا ذکر ولی کی خصوصیات کے عنوان سے کیا جا چکا ہے۔ ہر روز ایک مقرر وقت پر اپنے آپ سے باقاعدہ یہ سوالات کرے۔

(۱) کیا میں اللہ کے تمام احکام کی اطاعت محبت کے ساتھ کر رہا ہوں؟
(۲) کیا میں اپنے اعضاو جوارح کو اللہ کے ناپسندیدہ کاموں سے باز رکھنے میں کامیاب ہوں۔
(۳) کیا میں اپنے مولا سے ہر حالت میں راضی رہ کر اس کا شکر ادا کر رہا ہوں؟

جو شخص اخلاص اور باقاعدگی کے ساتھ روزانہ اس طرح اپنا محاسبۂ نفس کرتا رہے گا اور اس کی روشنی میں اپنی اصلاح کے لیے کوشاں رہے گا' امید ہے کہ اس کے اندر بتدریج یہ اوصاف و خصوصیات پیدا ہو جائیں گی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اپنی غلطیوں کو دُور کر کے اس راہ میں پیش قدمی کرنا ہو تو خود ہم ہی کو مجاہدہ کرنا ہو گا' دوسرا کوئی شخص ہمارے لیے یہ مجاہدہ نہیں کرے گا۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ تحریک اسلامی کی سخت ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے' دنیوی فرائض اور عائلی پریشانیاں جھیلتے ہوئے' اللہ کے ولی ہونے کا مجاہدہ کرنا کس طرح ممکن ہے؟ عام طور پر تو وہی لوگ ولی اللہ سمجھے جاتے ہیں جو نہ تو دعوت دین کا فریضہ ادا کرتے ہیں' نہ معاشرہ کی خدمت و اصلاح کے جھمیلوں میں پڑتے ہیں' اور نہ ہی ان کے کندھوں پر عائلی ذمہ داریاں ہوتی ہیں بلکہ وہ تنہائی میں صرف نوافل پر نوافل ادا کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ولایت کا یہ بالکل ایک غلط تصور ہے جو معاشرہ میں رائج ہے۔ صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر اللہ کے ولی کون ہو سکتے ہیں؟ ان کی زندگیاں' جو فرائض و نوافل کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی ذمہ داریوں اور دشواریوں سے بھری پڑی ہیں' وہی ہمارے لیے قابل اتباع ہیں۔ جو زندگی ان کی زندگیوں سے مختلف ہو' وہ مسلمانوں کے لیے قابل اتباع نہیں ہو سکتی۔

ایک سفر کے دوران چند صحابہؓ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنے کسی ساتھی کی تعریف کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اس تعریف کا سبب پوچھا۔ انھوں نے کہا: ہم نے جب سے یہاں پڑاؤ کیا' ہم تو خیمہ لگانے' گھوڑوں کو باندھنے' انھیں چارہ کھلانے اور سامان ٹھیک کرنے میں لگ گئے' مگر ہمارا یہ ساتھی نفلی عبادت میں مشغول ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: تمھارے اس ساتھی کے گھوڑے اور سامان کی خبرگیری کس نے کی؟ انھوں نے کہا: ہم ہی نے سب کچھ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم سب اس سے بہتر ہو۔ سبق حاصل کرنے کے لیے یہی واقعہ کافی ہے۔

ہمارے معاشرے میں اسلام کے بارے میں صحیح علم کی بہت کمی ہے۔ اور اسی لاعلمی کے سبب سے "ولی اللہ" کے بارے میں بھی لوگوں کا تصور صحیح نہیں ہے۔ جو سچے اولیاء اللہ ہیں وہ یہ بالکل پسند نہیں کرتے کہ لوگ انھیں اللہ کا ولی سمجھ کر خراجِ عقیدت پیش کریں' بلکہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا کم ترین بندہ ہی سمجھتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ گہری محبت پیدا کی جائے۔ یہ محبت اس وقت تک پیدا نہیں ہو گی جب تک رات کے آخری حصہ میں --- جب ساری دنیا سوئی ہوئی ہو --- اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری نہ دی جائے۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: تم کو رات کے آخری حصہ میں جاگنا چاہیے کیونکہ یہ صالحین کا طریقہ ' تمھارے پروردگار کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ' پچھلے گناہوں کا کفارہ اور مستقبل کے گناہوں سے سلامتی کا ضامن ہے۔

نکتہ ششم : انصار اللہ

انصار اللہ کے معنی ہیں' اللہ کے مددگار۔ اللہ کی مدد کرنے کے مفہوم کی متعدد آیات قرآن کریم میں موجود ہیں' مثلاً: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ "اے ایمان والو! تم اللہ کے مددگار بن جاؤ" (الصف ۶۱: ۱۴)۔

یہاں ان آیات میں اللہ کی مدد کرنے کی جو تاکید کی گئی ہے اس کا اصل مطلب کیا ہے۔ کیا اللہ انسان کی مدد کا محتاج ہے؟ درحقیقت تو بے آسرا انسان ہمیشہ اللہ کی مدد کا محتاج ہے۔ پھر اللہ کی طرف سے انسان سے مدد کی اپیل کرنے کا کیا مطلب؟ یہ کوئی بہت ہی معنی خیز بات معلوم ہوتی ہے۔

آیئے ہم اس راز کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

جب اللہ تعالیٰ کے کسی مومن بندہ کی کوششوں سے کسی گمراہ آدمی کو توبہ کی توفیق اور ہدایت مل جاتی ہے' تو اللہ تعالیٰ بے انتہا خوش ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اس خوشی کو سمجھانے کے لیے رسول اللہ ؐ نے ایک نہایت عمدہ مثال دی ہے۔ وہ مثال یہ ہے کہ ایک مسافر نے ذرا ستانے کے لیے اپنا سفر تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کیا اور ایک درخت کے نیچے سو گیا۔ جب جاگا تو دیکھا اس کا اونٹ غائب ہے۔ چونکہ اونٹ ہی کی پشت پر اس کا کھانا اور پانی تھا' اس لیے اس کی پریشانی کی کوئی حد نہ رہی۔ سخت اضطراب کی حالت میں اس نے اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا مگر اونٹ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بالآخر انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ موت کو یقینی جان کر دوبارہ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اچانک دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ حاضر ہے۔ اس وقت اس کی زبان پر جو کلمۂ شکر جاری ہوا وہ مارے خوشی کے الٹ گیا۔ وہ کہہ بیٹھا: "اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں"۔ اللہ کے رسول ؐ

نے فرمایا کہ گم شدہ اونٹ واپس ملنے پر یہ شخص جتنا خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بھٹکے ہوئے بندے کے ہدایت کے راستے پر واپس آنے پر اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ گمراہ بندوں کی ہدایت کا کام کتنی بڑی فضیلت کا کام ہے۔ درحقیقت یہی سمجھانے کے لیے رسول اللہ ؐ نے ایسی انوکھی مثال دی ہے۔

انسان کو ہدایت کے راستے پر لانے کی قدرت اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کو بھی نہیں دی ہے۔ رسول اللہ ؐ نے اپنے محبوب چچا ابوطالب کی وفات کے وقت بہت کوشش کی کہ وہ ایمان لا کر دنیا سے رخصت ہوں۔ اس کوشش کے پیچھے وہ فطری محبت کارفرما تھی جو اپنے چچا کے لیے آپ ؐ کے دل میں راسخ تھی کیونکہ انھوں نے نہ صرف پدرانہ شفقت سے آپ ؐ کی پرورش کی بلکہ نبوت کے انتہائی جاں گسل دنوں میں دشمنوں کے سامنے سینہ سپر ہو کر آپ ؐ کی حفاظت کی۔ مگر چچا کو صاحب ایمان بنانے کے لیے آپ ؐ کی کوشش اور آرزو پوری نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے رسول ؐ، آپ کسی آدمی کو صرف اپنی محبت کی بنا پر ہدایت نہیں کر سکتے۔ ہدایت کی توفیق تو اللہ تعالیٰ صرف اسی کو دیتا ہے جس کو وہ دینا چاہتا ہے (القصص ۲۸:۵۶)۔

انسان کی ہدایت کا پورا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ انبیا کرام کو بھیجنے کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ انسان کو ہدایت کے راستے کی طرف لانے کی کوشش کریں۔ انبیا کرام پر ایمان لانے والوں پر بھی یہی ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ہدایت دینے کی قدرت و اختیار سے محروم رکھا گیا، ہدایت کی کوشش کرنے کی ذمہ داری انھیں کیوں سونپی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہدایت قبول کرنے یا نہ کرنے کی پوری آزادی دی ہے۔ کوئی چاہے تو ہدایت کو قبول کرے، چاہے تو نہ کرے۔ مگر جو لوگ ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہوں، ان کو ہدایت کا راستہ دکھانے کا کچھ انتظام ہونا چاہیے۔ انبیا کی بعثت کا مقصد یہی ہے۔ جو لوگ انبیا کرام کی دعوت پر ہدایت قبول کرتے ہیں ان پر یہ ذمہ داری اسی لیے عائد کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہدایت دینے کا مکمل اختیار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے نہ تو آسمان سے کوئی وعظ کرنے کا انتظام کیا ہے اور نہ ہی خود زمین پر اتر کر لوگوں کو سمجھانے کا طریقہ اپنایا ہے۔ جو حضرات دعوت الی اللہ کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں، ہدایت پہنچانے کی عملی جدوجہد کا کردار ان ہی کے سپرد کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو انصار اللہ کے لقب سے نواز کر اسی مقام کا ذکر کیا ہے۔ تحریک اسلامی کے کارکنوں کے پروگرام کا باقی حصہ دعوتی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ ان کے ذریعے انصار اللہ کا مرتبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یاد رہے کہ "انصار اللہ" کا یہ لقب اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور شفقت سے دیا ہے۔ ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ دعوتی جدوجہد میں مشغول رہنے کی وجہ سے اپنے آپ کو انصار اللہ سمجھنے لگیں۔ دعوتی کام تو ہمیں اپنا فرض سمجھ کر رضائے الٰہی کے حصول کی نیت سے کرنا ہے۔

ایک کام اور ایسا ہے جسے کرنا ہمارا فرض ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کام کو ایک ایسا نام دیا ہے جس سے ان کی غایت درجے کی خوشنودی اور رضا ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ہے ان کے کام کے لیے خرچ کرنا۔ وہ کمال مہربانی سے اور بندوں کی ہمت افزائی کے لیے کہتے ہیں کہ بندہ مجھے قرض حسنہ دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا: مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا 'ایسا کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے (سورہ بقرہ ۲:۲۴۵ - سورہ حدید ۵۷:۱۱) اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کو اس لیے قرض قرار دیا کہ وہ اسے واپس کریں گے اور کئی گنا زیادہ کریں گے۔ ہم انھی کے دیے ہوئے مال کو ان کی راہ میں صدقہ کرتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی شان کریمی سے اسے قرض کا مرتبہ دیتے ہیں۔

اگر کسی نے محدود معنوں میں اللہ تعالیٰ کے ولی ہونے کے اوصاف تو اپنے اندر پیدا کر لیے مگر وہ دعوت الی اللہ کا کام نہیں کرتا تو، اللہ تعالیٰ اس سے خوش نہیں ہوتا۔ ایک مشہور حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریلؑ کو حکم دیا کہ فلاں شہر کو تباہ کر دو۔ جبریلؑ وہاں گئے تو دیکھا کہ اللہ کا ایک ولی ذکر میں مشغول ہے۔ انھوں نے اللہ سے پوچھا کہ ایسے ایک ولی کی موجودگی میں میں اس خطہ زمین کو کیسے تباہ کر دوں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس ولی سمیت ہی تباہ کر دو' کیونکہ اس خطہ کے تمام باشندے گمراہ ہو چکے ہیں۔ ان کو ہدایت پہنچانے کی کوشش کرنا تو درکنار، میری نافرمانیاں ہوتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑتا۔

اس سے ثابت ہوا کہ دعوت الی اللہ کا کام اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی قدر و منزلت رکھتا ہے۔ یعنی انصار اللہ کا درجہ اولیاء اللہ سے فائق تر ہے۔

ایک مرد مومن اللہ کا سپاہی ہوتا ہے۔ انسانی معاشرہ اللہ کی مملکت ہے۔ اس میں اللہ کی نافرمانی ہونا اللہ کی مملکت میں بغاوت پھیلنے کے مترادف ہے۔ معاشرہ کے افراد کو اللہ کے قانون کی اطاعت کی طرف بلانا، اس کی ترغیب دینا، اور اس جدوجہد میں ہر طرح کی مدد پیش کرنا ایک ایسا کام ہے جس کے لیے اللہ کے سپاہی کا اپنے دل میں جذبہ اور ولولہ محسوس کرنا ایک فطری بات ہے۔ ایک سپاہی کے لیے یہ بات ہرگز کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ صرف ذاتی طور پر نماز و روزہ ادا کرتا رہے اور اس کے ارد گرد اللہ کی نافرمانی ہوتی رہے۔ سپاہی ملک کی حفاظت اور دفاع کے لیے ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے سپاہی، ہر مرد مومن پر فرض ہے کہ وہ اللہ کی اس مملکت میں انسانوں کو اللہ کی نافرمانی سے روکے۔

رسول اللہ ؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس طاقت ہے اسے چاہیے کہ طاقت کو استعمال کر کے اللہ کی نافرمانی بند کرے ۔ اگر اتنی طاقت نہ ہو تو زبان سے سمجھا کر بند کرنے کی کوشش کرے ۔ اگر یہ طاقت بھی نہ ہو تو دل ہی دل میں برائی کو بُرا سمجھے اور سوچ بچار کرے کہ بُرائی کو روکنے کا کیا طریقہ نکالا جاسکتا ہے ۔ جو شخص یہ آخری درجے کا کام کرے ' وہ کمزور ترین ایمان رکھتا ہے ۔

بعض حضرات نے آخری حصہ کے معنی یہ لیے ہیں کہ دل ہی دل میں بُرے کام کی مذمت کرنا کافی ہے ' مگر یہ صحیح نہیں ہے ۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہاتھ ' زبان یا دل سے برائی کو بدل دینے کی کوشش کی جائے ۔ اس لیے دل میں صرف نفرت کرنا کافی نہیں ہو سکتا ۔ محض نفرت سے آخر کیا بدلے گا؟ بدلنا ہو تو کم سے کم تدابیر کے بارے میں غور و فکر کی ضرورت ہے ۔

نکتہ ہفتم : خلفاء اللہ

خلیفہ کے معنی ہیں نمائندہ ۔ نمائندہ کا کام یہ ہے کہ وہ اس ذات کی مرضی کے مطابق کام کرے جس کی نمائندگی کر رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ' میں زمین میں اپنا خلیفہ بھیجنے والا ہوں (البقرہ ۲: ۳۰) کا اعلان کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی ۔ انسان کو دنیا میں یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اللہ ہی کا کام کرے ۔ اگر اس نے یہ کام کیا تو وہ "خلیفۃ اللہ" کے مرتبہ پر فائز ہو گیا ۔

اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے لیے قانون یا نظام تجویز کیا ہے ۔ سورج سے لے کر ذروں تک ہر مخلوق اپنے خالق کا تجویز کیا ہوا قانون اور نظام زندگی ماننے اور اس کے مطابق چلنے کی پابند ہے ۔ اس قانون سے سرتابی کرتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق چلنے کا اختیار کسی کو نہیں ۔ اس اطاعت کے لیے وہ کسی فضیلت یا شرف کے مستحق بھی نہیں ۔

مگر نوعِ انسانی کے لیے جو نظام اور قانون بنایا گیا اسے انبیا کرام کی وساطت سے اس کو بھیجا گیا ۔ اس قانون کو اللہ تعالیٰ نافذ نہیں کرتا ' اس کی ذمہ داری اس نے اپنے رسولوں کے واسطہ سے انسان پر ڈال دی ہے ۔ اگر انسان رسول کی وساطت سے بھیجے ہوئے اس نظامِ الٰہی کو اللہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے دنیا پر نافذ کرے ' تو وہ "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر فائز ہو گا ۔ اس عظیم المرتبت منصب پر فائز ہونے کا موقع دینے کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو دنیا میں بھیجا ہے ۔

اگر آپ کو "خلیفۃ اللہ" کا اعزاز حاصل کرنا ہے تو قانونِ الٰہی کو نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا ہو گی ۔ تحریک اسلامی اللہ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کا دین اس کی شریعت اور اس کا قانون جاری و ساری کرنے کی

جدوجہد میں مصروف ہے ۔ اللہ کا یہ نظام قائم کرنے کے لیے جس پایہ کے صالح لوگوں کی ضرورت ہے ' وہ تیار کرنے کے لیے اس تحریک نے اپنے کارکنوں کے لیے ایک تربیتی پروگرام تجویز کیا ہے ۔

انسان کو خلافت کی جو ذمہ داری سونپی گئی ہے ' اس کی مناسبت سے یہ دو باتیں قابل غور ہیں ۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا ہے کہ اس زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔ "اے انسانو اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے زمین کی تمام مخلوقات کو تمہارے لیے پیدا کیا ہے" ۔ (البقرہ ۲ : ۲۹) انسان کو اتنا علم اور قدرت بخشی گئی ہے کہ وہ اللہ کی تخلیق کی ہوئی اشیا کو اپنی مرضی کے مطابق آزادانہ استعمال کر سکے ۔ اس لیے صرف انسان ہی کو سائنسی ترقی نصیب ہوئی ۔ دنیا میں جتنی اشیا اور قوتیں موجود ہیں ان کو جاننا اور نوع انسانی کے فائدے کے لیے انھیں استعمال کرنا انسان ہی کا کام ہے ۔ یہ بھی خلیفہ کا کام ہے ۔

(۲) انسان صرف خلیفہ ہے ۔ خلیفہ کو ذاتی ملکیت کا حق نہیں ہوتا ۔ ملکیت صرف اسی کی ہے جس کا وہ خلیفہ ہے ۔ اس اعتبار سے انسان کے دنیا میں مالک اصلی ہونے کی کوئی گنجایش نہیں ہے ۔

تحریک اسلامی میں ان چاروں مراتب عالیہ کے حصول کے لیے مواقع موجود ہیں ' جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں اپنے مومن بندوں کے ضروری اوصاف کی حیثیت سے کیا ہے ۔ اقامت دین ان چاروں مراتب کے بیک وقت حصول کا سب سے موثر اور یقینی ذریعہ ہے ۔ کسی تحریک میں شامل ہوئے بغیر صرف ذاتی کوششوں سے انسان محدود معنوں میں عباد اللہ سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ رہے وہ حضرات جو کسی پیرو مرشد کی نگہبانی میں مراقبہ و مجاہدہ کرتے ہیں ' تو وہ زیادہ سے زیادہ محدود معنوں میں اولیاء اللہ کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں ۔ مگر باقی دو رتبے یعنی "انصار اللہ" اور "خلفاء اللہ" پر وہ کیسے فائز ہو سکیں گے ۔ محض تبلیغی کام کر کے انصار اللہ بننے میں جزوی کامیابی ممکن ہے لیکن خلفاء اللہ کا درجہ حاصل کرنا پھر بھی باقی رہ جاتا ہے ۔

٠٠٠٠

حضرت معاذ بن جبل ؓ سے روایت ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو یمن کی

طرف روانہ کیا،

تو نصیحت فرمائی:

ایاک و التنعم ، فان عباد اللہ لیسو ا بالمتنعمین

(رواہ احمد)

معاذ! آرام طلبی اور خوش عیشی سے بچتے رہنا۔

اللہ کے خاص بندے آرام طلب اور خوش عیش نہیں

ہوتے۔ (مسند احمد)

اللھم لا عیش الا عیش الاخرۃ

٠٠٠

جسٹس کارنیلیس اور اسلامی حدود

چوہدری محمد یوسف

اسلامی حدود و تعزیرات کی حکمت سے ناواقف لوگ ان سزاؤں کو وحشیانہ قرار دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں پاکستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر اے آر کارنیلیس کی تقاریر اور مضامین کی ترتیب کے دوران اس موضوع پر ان کے دو مقالات میرے سامنے آئے۔ قارئین کو شریک استفادہ کرنے کے لیے میں نے ان کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ وہ ایک مربوط مضمون بن جائیں۔ میرے ربطیہ جملوں کے علاوہ موصوف کے مقالات سے اقتباسات کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے' اور ان کے حوالے درج کر دیے گئے ہیں۔

آج جب کہ اسلامائزیشن کا عمل اپنی راہ کا متلاشی ہے' یہ کاوش دلچسپی کا باعث ہوگی۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جناب کارنیلیس کے رشحات فکر کو اسلامی تعلیمات پر پرکھنا اس بنیادی استدلال کو ضائع کرنے کے مترادف ہو گا جو موصوف نے اسلامی قانون فوجداری کو تقویت فراہم کرنے کے لیے بحیثیت ایک غیر مسلم کے اپنی اجتہادی بصیرت اور بصارت صرف کر کے کیا ہے۔ انھوں نے مروجہ تعزیراتی نظام کی ناکامی کا اعتراف کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے قید کی سزا پر شدید تنقید کی ہے' اور اس سزا سے ماہرین قانون کے عدم اطمینان کے حوالے کے بعد متبادل سزاؤں کی جانب توجہ دلائی ہے۔ دراصل یہی وہ مقام ہے جو اسلامی حدود کی طرف مائل کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔ جناب کارنیلیس نے اس صورت حال کے گہرے احساس کے ساتھ اسلامی حدود کا مقدمہ جس طرح کامیابی سے پیش کیا' انھی کا حصہ ہے۔ ہمیں جناب کارنیلیس کے خیالات کو اس پس منظر میں لینا چاہیے۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جناب کارنیلیس کے مخاطب ماہرین قانون تھے۔ خاص طور پر سڈنی کانفرنس میں ان کا خطاب ماہرین قانون کے ایک بین الاقوامی اجتماع سے تھا۔ ایسے مواقع پر طرز تخاطب اور استدلال اہل ایمان سے بہر صورت مختلف ہو گا۔

ماضی کا ورثہ

دنیا کے قانون کے ماہرین نے انسداد جرم کے بارے میں جو کاوشیں کی ہیں وہ عموماً کامیاب اور موثر ثابت نہیں ہوئی ہیں۔ انسانی فطرت میں ودیعت شدہ برائی نیکی پر غالب آ جاتی ہے۔ برائی کے ارتکاب میں انسان نے بلا کی ذہانت استعمال کی ہے۔ اس نے جرم کے نت نئے طریقے ایجاد کیے ہیں' اور پھر ان پر عمل کرنے میں وہ اور بھی جری واقع ہوا ہے۔ اس کے برعکس نیکی کو عزیز رکھنے والے

انسداد جرم کے لیے پیشگی تدابیر سوچنے اور انسدادی اقدام کرنے میں کوتاہ عمل رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جرائم کی رفتار پر کوئی موثر روک تھام نہیں ہو سکی ہے۔ انسان کی افتادِ طبع کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب جرم اپنی قبیح شکل میں رونما ہو جاتا ہے تو وہ اس کے سدِباب کے بارے میں سوچنا شروع کرتا ہے۔ سوچ کا یہ مرحلہ ابھی نامکمل ہوتا ہے کہ ارتکاب جرم کی نئی اور قبیح تر صورت سامنے آ جاتی ہے۔ اس طرح وہ برائی کے تعاقب میں کم از کم دو قدم پیچھے رہتا ہے۔

چند سال پہلے تک مستورات کو سرِعام برہنہ کر کے رقص کرانے کا تصور ہمارے ہاں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کی ابتدا نواب پور کے واقعہ سے ہوئی، اور اب ایسا گھناؤنا جرم ایک معمول بنتا جا رہا ہے۔ اسی طرح میت کو قبر سے نکال کر اس کے ساتھ بدکاری کی مثال ہمارے علم کی حد تک برصغیر کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ مگر انسانی ذہن اتنی پستی تک گیا۔

ایسی قبیحات کا پیشگی تصور کرنا، اور ارتکابِ جرم سے پہلے موثر انسداد اور سزا کا تعین کرنا انسانی فکر کے لیے ممکن نظر نہیں آتا۔ جرم و برائی کے انسداد کے لیے نیکی کو برائی سے دو قدم آگے آنا پڑے گا۔ بھلائی کی اس پیش قدمی کی ایک صورت ہے کہ انسان اپنے خالقِ حقیقی کی عطا کردہ راہ نمائی قبول کرے۔ شیطانی فکر کا توڑ رحمانی راہ نمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن رحمانی ہدایت کو اساطیر الاولین قرار دے کر ایک طرف رکھ دیا گیا ہے۔ مروجہ قانونِ جرم و سزا کی ناکامی کے پیشِ نظر قدیم کی طرف رجوع کی ضرورت کا اظہار جسٹس کارنیلیس ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"صاف بات ہے کہ جرائم کی بڑھتی ہوئی رفتار کو روکنے کے تمام اقدامات ناکام ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان اقدامات کے بارے میں نئے سرے سے غور کی ضرورت مسلمہ ہے۔ اس بارے میں قدما کے تجربات کو "قدامت" کے طعنہ کے تحت مسترد کر دینا مناسب نہیں"۔ (۱)

زندگی میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ ماضی سے بیزاری کو فکر کی بنیاد بنا لینا کسی بھی طرح معقول نہیں ہو سکتا۔ انسانی ترقی کی "معراج" یہ ہے کہ آج بھی وہ رنگ و نسل کی بنیاد پر قتل و غارت کرتا ہے۔ ہوس کی تکمیل کے سارے مواقع کے باوجود زنا بالجبر کرتا ہے۔ ساری آسایش مہیا ہونے کے باوجود دوسروں کے مال و متاع پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ مُردوں کو جلاتا ہے، پیشاب پیتا ہے اور سرِعام برہنہ پھرتا ہے۔ پستی کی اس سطح پر رہ کر قدامت پسندی پر طنز کسی طرح زیبا نہیں۔ قدیم روایات و تعلیمات میں اگر کوئی قابلِ قدر چیز ملتی ہے تو اسے قصۂ ماضی قرار دے کر رد کرنا درست نہیں۔ ماضی سے تعصب غیر معقول ہے۔ یہ فکر کی بلندی نہیں، پستی ہے۔ صحت مند فکر، ماضی کے تجربہ سے استفادہ کر کے مستقبل کے لیے راہ متعین کرتی ہے۔ آج جبکہ انسدادِ جرم کی کوششیں اس کی افزایش کا سبب بن گئی ہیں تو اس بات کی

ضرورت ہے کہ ماضی کی روایات کی روشنی میں ہی جرم و سزا کے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے۔

عدالتی دائرۂ کار اور طریق کار

جرم کی تعریف کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

جرم و سزا کے سلسلے میں جرم کی تعریف، تفتیش، سماعت، اور سزا کی نوعیت بے حد اہم ہیں۔ جرم کی تعریف میں بنیادی کوتاہی یہ ہے کہ اسے دیوانی ضرر کے بجائے مملکت اور معاشرہ کے خلاف جرم تعبیر کر کے شدید مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ اس طرح مملکت کو جرم کے خلاف مدعی کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ جسٹس کارنیلیس کے مطابق:

"میرے خیال میں برطانوی انصاف کے تصور میں غلطی یہ ہے کہ معمول کے جرائم کو تفتیش اور سماعت میں مملکت کی ایجنسیوں کے دائرۂ کار کے تحت لانے میں زیادتی ہوئی ہے"۔(۲)

اس طرح ہر جرم پولیس اور عدالت کے دائرۂ کار میں آ گیا۔ حالانکہ ان کے بقول:

"بے شمار معاملات میں پولیس اور مجسٹریٹ کی مداخلت سے احتراز کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مخصوص حالات کے پیش نظر معاملات کو مملکت کی سطح کے بجائے مقامی طور پر طے کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے زیادہ کا اثر محدود علاقہ تک ہوتا ہے۔ اس طرح معاملات طے کرنے کا یہ انداز زیادہ موثر ہے"۔(۳)

وجہ یہ ہے کہ "ہمارے وطن میں جرائم کا ارتکاب عموماً عام جذبات کے تحت ہوتا ہے"۔(۴)

"جہاں بڑے جرائم --- قتل، اغوا، مویشیوں کی چوری اور راہ زنی وغیرہ کا ارتکاب خاندانی دشمنی اور عزت و وقار کی خاطر ہوتا ہے۔ جہاں آبادیوں کی نوعیت یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی بستیاں لمبی مسافتوں پر منتشر صورت میں واقع ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان پر قبائل اور برادریوں کے اپنے موثر چودراہٹیں اور سرداریاں قائم ہیں۔ وہاں پولیس کے لیے کسی رپورٹ شدہ جرم کی تفتیش میں قانونی معیار پر پورا اترنے والے شواہد اکٹھا کرنا بے حد مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ دیہات میں آبادیوں کا ایسا انتظام موجود ہے کہ جس میں عموماً جرم کی شناخت کے بارے میں مقامی اطلاع مکمل اور درست ہوتی ہے"۔(۵)

"موجودہ نظام کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ ہر فوجداری کیس کا فیصلہ اسی نوعیت کے کئی مقدمات کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔ عدالتیں کھلی عدالت میں پیش ہونے والی شہادت پر انحصار کرتی ہیں جو حلف پر لی جاتی ہے۔ حالانکہ اس حلف کی کوئی وقعت نہیں۔ علاوہ ازیں وہ شہادت کے لیے ایسے کڑے معیار اختیار کرتی ہیں جن میں سے بعض حقیقت معلوم کرنے کے لیے بڑے اہم ہو سکتے ہیں مگر

اس کا نتیجہ بہرحال قصورواروں کی بریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایسے مقدمات کی بھی بڑی تعداد ہے' جن میں بے گناہ سزائے موت تک پا جاتے ہیں۔ قصور وار کی بریت یا بے گناہ کی سزایابی' دونوں صورتیں 'انتقام اور دشمنی کے بیج بو دیتی ہیں"۔(۶)

فوج داری نظام --- جسٹس کارنیلیس کے نزدیک

"ملزم کو بہر صورت بے گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ جملہ قیاسات کو اسی کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔ اور تمام بارِ ثبوت' جو کہ اعلیٰ ترین فنی ضوابط کے ماتحت جانچ کر قبول کیا جاتا ہے' استغاثہ کے ذمہ ہوتا ہے"۔(۷)

"یہ طریق کار' موجودہ فوج داری قانون کو جرم کے خاتمے میں ناکام بنا دیتا ہے۔ ان حالات میں یہی سوچنا پڑتا ہے کہ فراہمی انصاف کا فرض لوگوں کے ہاتھ میں کیوں نہ دے دیا جائے"۔(۸)

مقامی طور پر مقدمات کے تعین کے حق میں وہ لکھتے ہیں:

"مقامی طور پر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ امن اور سکون قائم رہے۔ اس کے لیے اکثر مقدمات میں سزاؤں کی وجہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس بارے میں قانونی اور فنی ضوابط کا بہت زیادہ لحاظ کرنے کے بجائے' ملزم کی کوتاہی کا تعین' اسے مائل بہ اصلاح کرنے کی صورت گری' مقامی امن و سکون کی بحالی' اور ستم رسیدہ کی دادرسی کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے"۔(۹)

"یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ' مقامی طور پر' ستم رسیدہ شخص کی دادرسی کو ملزم کی سزایابی کے مقابلے میں ترجیح دی جاتی ہے' جبکہ قانون اپنے سارے عمل کو ملزم کے خلاف مرکوز کر دیتا ہے۔ متاثرہ شخص کو معاوضہ دلائے جانے کا تو وہاں کوئی تصور ہی نہیں' جب کہ مقامی رواج جرم کو عموماً دیوانی نوعیت کا ضرر خیال کرتا ہے"۔(۱۰)

معاشرہ کی روایات اور مُسلّمہ اصولوں کے مطابق عدل و انصاف کرنے کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"اس مرحلے پر یہ بات طے طلب ہے کہ رواج کب' کیسے اور کس درجہ میں قانون کو راہ دے دے۔ یہ فیصلہ ہمیں خود ہی کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس بارے میں مروجہ ضوابط قانون کی پیروی ضروری نہیں۔ یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ قانون کسی بھی سوسائٹی کے اندر سے جنم لیتا ہے۔ فی الواقع یہ سوسائٹی کی شخصیت عامہ کا اظہار ہے۔ ایک سوسائٹی کے اصولوں کا اس سے مختلف سوسائٹی پر اطلاق مہلک نتائج کا پیش خیمہ ہو گا۔ مقامی عدالت کبھی جرم میں مبالغہ آمیزی نہیں کرے گی' بلکہ وہ اسے مناسب حد تک محدود رکھے گی"۔(۱۱)

"ہر کوئی جانتا ہے کہ وسطی ممالک اور مشرق وسطی سے باہر زیادہ تر مسلم ممالک میں خاندانی دشمنیوں کے نتیجے میں ہونے والے جرائم کا تصفیہ ایک فریق کی جانب سے دوسرے فریق کو ونٹے میں لڑکی کا رشتہ دے کر کیا جاتا ہے۔ اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ روایتی انداز میں زندگی بسر کرنے والے معاشرے سوسائٹی میں متحارب گروہوں کے عناد کو ہوا دینے کے بجائے کم کر کے توازن کی صورت دینے کو اہمیت دیتے ہیں"۔ (۱۲)

عہد حاضر کے قانونی نظام میں قید کی سزا بھی جرائم میں کمی کے بجائے افزائش کا موجب ہے۔ جیلوں کو اصلاح و تربیت کے مقصد کے تحت قائم کیا جاتا ہے، مگر وہ جرائم کی تربیت کا ذریعہ بن گئی ہیں۔ جیل میں تو گرفتاروں کو تجربہ کار استاد میسر آجاتے ہیں۔ جیل مجرم کو معاشرے سے کاٹ کر اور معاشرتی دباؤ سے آزاد کر کے تجربہ کار مجرموں کی ہمہ وقتی تحویل میں دے دیتی ہے، جن کے ساتھ وہ شب و روز گزارتا ہے۔ اگر جیل کے بجائے وہ معاشرے میں رہے، جہاں جرم کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو اس کی اصلاح کے امکانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔ جیل جاکر اصلاح کے یہ امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسی کوئی مثال حوالے کے لیے بھی مشکل ہی سے پیش کی جاسکتی ہے کہ کوئی شخص جیل سے سدھر کر نکلا ہو۔ اس لحاظ سے اتنا بھاری بھرکم ادارہ جیسا کہ جیل کا ادارہ ہے، مکمل طور پر بیکار ثابت ہوا ہے۔ کارنیلیس کے الفاظ میں:

"آج ایسا دور ہے کہ دنیا بھر میں عام آدمی کا اپنے روز مرہ اخراجات حاصل کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ ارتکاب جرم کے "صلہ" میں قید کی شکل میں اعلیٰ ترین سہولیات کا حصول ارتکاب جرم کا محرک بن گیا ہے۔ اگرچہ یہ کہنا کہ قیدی کی سزا جرم کی حوصلہ شکنی کے لحاظ سے مکمل طور پر بیکار ہو گئی ہے، کچھ مبالغہ ہو گا۔ مگر اس کے باوجود ایک آدمی کی طرف سے یہ مطالبہ کہ اسے جیلوں پر اٹھنے والے بے پناہ اخراجات کے بوجھ سے سبک دوش کر دیا جائے، بالکل بجا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جیلیں جرائم کو روک نہیں سکتیں، تو اتنے سارے اخراجات ثابت شدہ سماج دشمنوں کی آسائش کے لیے تو نہیں کیے جاسکتے۔

اس لیے اس سے کہیں کم خرچ اور موثر سزائیں اگر موجود ہوں تو ان کو اختیار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ جو پاکستانی بھی سعودی عرب گیا ہے وہ اس ملک میں امن و سلامتی کے اعلیٰ ترین معیار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہر جانے والا اس ذکر سے نہیں تھکتا کہ چوری کے لیے قطع ید کی سزا، جو فوری طور پر سرعام نافذ کر دی جاتی ہے، جرم کے مکمل سدباب کا باعث ہوئی ہے۔ حالانکہ اس کا نفاذ بہت ہی کم مقدمات میں کیا گیا ہے"۔

"بہت سے جرائم تشدد کے لحاظ سے سماج دشمن نوعیت کے ہیں۔ ان کا سدباب بھی اسی طریقہ سے کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ڈکیتی' جس میں پانچ یا اس سے زیادہ افراد شریک ہوں' اور ارتکاب جرم کے لیے تشدد کے ساتھ ساتھ رات کا وقت منتخب کیا گیا ہو' جبکہ لوگ دور دراز آبادیوں میں سکون کی نیند سو رہے ہوں اور جو اکثر و بیشتر واردات قتل پر منتج ہوتی ہے"۔

"موجودہ ترقی یافتہ دور میں یہ ضروری نہیں کہ یہ مقصد پاؤں کاٹ کر ہی حاصل کیا جا سکے۔ طب اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ مجرم کو معمولی جراحت کے نتیجے میں ہاتھ یا پورے بازو کے استعمال سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ محرومی بغیر جراحت کے بھی ممکن ہے' اور اس کا انتہائی دورانیہ بھی مقرر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر جراحت کرنا پڑے تو بھی جنگ میں معذور ہونے والے افراد کی بحالی کے تجربات ایسے افراد کی اصلاح کے بعد بحالی کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ بہرحال سزا پانے والا مکمل معذور ہونے کے بجائے کسی درجہ میں تو اپنے معمولات انجام دے سکے گا۔ لیکن اگر نافذ شدہ معذوری مکمل بھی ہو تب بھی یہ محض قید کی سزا کے مقابلے پر بہتر ہوگی۔ شعور عامہ مناسب مقدمات میں موت تک کی سزا کا مقتضی رہا ہے۔ سوسائٹی کے تحفظ کے لیے معذوری جیسی مناسب اور منصفانہ سزا اس کے لیے مشکل ہی سے ناگوار ہوگی۔ جبکہ یہ سزا بعض اقسام کے جرائم کے خاتمے کا موجب ہو گی"۔ (۱۳)

"مجھے معلوم ہے کہ سزا کا معاملہ بہت سے حلقوں میں غور و فکر کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس مرحلہ میں میری گزارشات برموقع ہو سکتی ہیں۔ بہرکیف میرا پختہ یقین ہے کہ سزائے قید کے عالمی سطح پر رائج ہونے کے باوجود یہ جرم کے سدباب اور معاشرے کے مفادات کے تحفظ میں موثر ہے اور نہ ہی معقول"۔ (۱۴)

لہٰذا ارتکاب جرم کی پُرتشدد کاوشوں کے سدباب کے لیے ہاتھ' بازو یا ٹانگ کو مصنوعی طور پر بیکار بنانے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ سزائیں اپنے انذاری اثرات کے لحاظ سے جرائم کا قلع قمع کرنے میں انتہائی موثر ہیں۔ عادی اور پختہ کار مجرم جو اپنی سماج دشمنی میں تشدد کو بھرپور طور پر بروئے کار لاتے ہوں' یہ سزائیں ان کے لیے ہیں۔ ان سزاؤں کو بعض لوگ' خصوصاً افریقی ممالک کے قانون دان' دورِ ظلمت کی طرف مراجعت قرار دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اہل افریقہ اپنے طویل اور خاص پس منظر کے تحت ایسا سوچ سکتے ہوں۔ اس کے باوجود بہت سے اربابِ فکر نے اس بارے میں میری گزارشات کو قابلِ غور گردانا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ صدی کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ قید کی سزا اوپر ذکر کردہ جرائم میں تادیبی ہے نہ اصلاحی' اور نہ ہی یہ قصاصی اثر رکھتی ہے"۔ (۱۵)

"اس مرحلہ پر میں یہ سوال پوچھتا ہوں کہ تحریروں اور دستخطوں کے ماہر جعل ساز کے لیے قید کی سزا کس طرح مناسب ہو سکتی ہے؟ وہ قید میں رہتے ہوئے اپنا کاروبار جاری رکھ سکتا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں ایسے مجرموں کے ہاتھ کا عمدہ توازن مستقل یا عارضی طور پر معمولی جراحت سے ختم کر دیا جائے۔ یہی معاملہ جیب تراش کا ہے"۔ (۱۶)

عدالتی طریقِ کار

انگلینڈ اور ویلز میں جرائم میں اضافے کی شرح ۵ سے ۱۲ فی صد ہے۔ جرائم کے بارے میں سروے رپورٹوں کے مطابق، نیویارک میں ایک سال کے دوران ۹۳ ہزار وارداتیں ہوتی ہیں۔ اتنے ہی عرصے میں چوری کی پونے دو لاکھ وارداتوں کو ریکارڈ پر لایا گیا ہے۔ یہ کیفیت ان انتہائی متمول معاشروں کی ہے جہاں قانون کا بھرپور احترام بھی پایا جاتا ہے۔

ماہرینِ قانون کی سڈنی کے مقام پر منعقدہ کانفرنس میں انگلینڈ کے ڈائریکٹر پبلک پراسیکوشن، مسٹر سکلبرن نے اپنے مقالے میں کہا:

"تمام قانونی ضوابط بے گناہ کو سزایابی کے امکان سے تحفظ کے لیے بنائے گئے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میزان کا پلڑا مشتبہ یا ملزم کے حق میں جھکا ہوا ہے۔ کوئی شخص اپنے آپ کو سزاوار ظاہر کرنے کا مکلف نہیں۔ اس اصول کے اطلاق میں مبالغہ جرائم کے خلاف جنگ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا ملزم جو تفتیش یا سماعت میں کسی سوال کے جواب سے انکار یا گریز کرے، عدالت کو اس کے خلاف قیاس کرنے کا اختیار ہونا چاہیے"۔ (۱۷)

اس سیاق و سباق میں جسٹس کارنیلیس دو اسلامی اصول ہائے قانون کا حوالہ دیتے ہیں:

"میں اس مرحلے میں مسلم اصولِ قانون کے دو مسلّمہ قواعد کا حوالہ پیش کروں گا جو صورتِ حال کا بہترین حل ہیں۔ پہلا قاعدہ یہ ہے کہ بارِ ثبوت مدعی پر ہے، اور حلف ملزم پر۔ دوسرا قاعدہ یہ کہ جو کوئی اعترافِ قصور کر لے اس کے ساتھ سزا میں نرمی برتی جائے گی۔ کامن لا میں ملزم حقائق کی جستجو میں معاونت سے مکمل طور پر مبرا ہے"۔ (۱۸)

کتنا فرق ہے دو مختلف نظام ہائے قانون کا۔ کامن لا ملزم کو تفتیش میں اعانت سے استثنیٰ دے دیتا ہے، مگر مسلم شہری عقوبتِ اُخروی سے نجات کے لیے رضاکارانہ اعتراف پر اصرار کر کے سنگ ساری جیسی سزا خوشی سے قبول کرتا ہے۔

حوالے

1- PLD 1965 JOURNAL 149 P 162.
2- -------------- do -------------- P 159
3- -------------- do -------------- P 160
4- PLD 1966 JOURNAL 82 P 83
5- PLD 1975 JOURNAL 49 P 157
6- -------------- do -------------- P 157
7- -------------- do -------------- P 158
8- PLD 1966 JOURNAL 82 P 66
9- PLD 1965 JOURNAL 149 P 159
10- -------------- do -------------- P 159
11- -------------- do -------------- P 159
12- -------------- do -------------- P 160
13- -------------- do -------------- P 161
14- -------------- do -------------- P 162
15- PLD 1966 JOURNAL 82 P 8384
16- -------------- do -------------- P 84
17- -------------- do -------------- 85
18- -------------- do -------------- 85

صنعتی تعلقات کا اسلامی ماڈل

مفتی محمد رفیع عثمانی

اس وقت پوری دنیا دوراہے پر کھڑی ہوئی ہے۔ سوشلسٹ نظام دم توڑ چکا ہے، اور سرمایہ داری نظام، پوری انسانیت پر اژدہا بن کر دندنا رہا ہے۔ دنیا کی نظریں کسی ایسے نظام کو تلاش کر رہی ہیں جو اس اژدہے سے انسانیت کا تحفظ کر سکے۔ اس موقع پر اُمتِ مُسلمہ کی عموماً اور مسلمان دانشوروں اور علمائے دین کی خصوصاً یہ بڑی بھاری ذمہ داری ہے کہ اسلام کے اس دعویٰ کا اپنی تحقیقات اور اپنے کردار سے ثبوت پیش کریں کہ وہ زندگی کے تمام مسائل کا بے نظیر حل اپنے پاس رکھتا ہے۔

اجتماعی زندگی کا ایک اہم دائرہ صنعتی تعلقات کا ہے، جس کے کسی ملک کی معیشت پر گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں ہمیں واضح اسلامی ہدایات ملتی ہیں۔ یہاں اس کے اسلامی ماڈل کے حوالے سے چند معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

آجر اور مستاجر کے درمیان تعلقات کی جو نوعیت اس زمانے میں ہو گئی ہے، عہدِ رسالت میں یہ حالات ہی نہیں تھے کہ ان کے بارے میں جزوی اور متعین احکام قرآن و سنت میں بیان کیے جاتے۔ لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ، وہ ہر چیز بیان کرتا ہے۔ یعنی قیامت تک جتنے مسائل انسانیت کو پیش آ سکتے ہیں، ان سب کے اصول اس قرآن میں ملیں گے۔ کہیں وہ اشارے کے طور پر ملیں گے اور کہیں اشارے سے بھی کم صرف ایک روح کے انداز میں ملیں گے، لیکن ملیں گے ضرور۔ ان کی مزید تفصیلات احادیث میں آتی ہیں۔ الحمدللہ، ہمارے پاس ایسا ذخیرہ موجود ہے کہ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ہم ان مسائل کے تفصیلی احکام مدون کر سکتے ہیں اور پیش کر سکتے ہیں۔

اللہ کے سامنے یکساں جواب دہی

سرمایہ داری یا سوشلسٹ نظام دونوں کی اصل یہ ہے کہ انسان بھی ایک جانور ہے اور جب یہ مر

جائے تو فنا ہو جائے گا۔ مرنے کے بعد کسی عمل کی جزا اور سزا نہیں ہے۔ جبکہ اسلام یہ کہتا ہے کہ انسان کی ازلی زندگی تو یوم آخرت سے شروع ہوتی ہے' اور ہر عمل کی جزا اور سزا آخرت میں ملنے والی ہے۔ اس لیے اللہ کی خوشنودی کے لیے دنیا میں جدوجہد کرنا بھی انسان کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ مال و دولت کمانا' صنعت و تجارت کرنا' مزدوری و ملازمت کرنا' یہ کوئی دنیا داری نہیں ہے' یہ بھی دین ہے' اور دو شرطوں کے ساتھ یہ بھی عبادت ہے۔ ایک یہ کہ نیت درست ہو' دوسرا یہ کہ عمل شرعی حدود میں رہتے ہوئے ہو۔ ان دو شرائط کی موجودگی میں ہر عمل عبادت بن جاتا ہے اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ وہ بنیادی بات ہے جو مسلمان مزدور' صنعت کار اور تاجر کے رگ و پے میں اچھی طرح سے سما جائے تو اجیر اور مستاجر کے تعلقات میں وہ انقلاب رونما ہو گا کہ نہ کسی ٹریڈ یونین کی ضرورت باقی رہ جائے گی' نہ یہ جھگڑے پیش آئیں گے جس میں آج ہماری صنعتی دنیا گرفتار ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ طلب الحلال فریضة بعد الفریضة' یعنی ارکانِ اسلام کے بعد یہ بھی دین کا ایک فریضہ ہے کہ انسان حلال کمائے۔ حلال کمانے کے لیے صنعت و تجارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے' مزدوری و ملازمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم ایک بات اور بھی کہہ رہا ہے۔ ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّةَ اللہ نے خرید لی ہیں مومنین کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے بدلے۔ (التوبہ ۹:۱۱۱) خریدار کون ہے' اللہ رب العالمین۔ فروخت کرنے والا کون ہے' مومنین ہیں' ہم لوگ ہیں۔ اور خریدی کیا چیز گئی ہے' ہماری جانیں اور مال۔ سودا کس چیز کے عوض ہوا ہے' جنت کے عوض۔ گویا ہر مومن اجیر ہے اور اللہ رب العالمین اس کا مستاجر ہے۔ یہاں صنعت کار اور اجیر کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ صنعت کار بھی اجیر ہے اور اجیر تو اجیر ہے ہی' اور یہ دونوں ایک رب العالمین کے سامنے جواب دہ ہیں۔ یہ جواب دہی کا نظریہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو انسان کو اور اسلامی معاشرے کو جور و ظلم سے بچانے کی واحد ضمانت ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات مثالی ہیں' اور پیشوں کی آزادی' پیشوں کا احترام' محنت کا احترام اور ذرائع معاش کی آزادی اسلام کے اقتصادی نظام کی بنیادی روح ہے۔

ٹریڈ یونین کی ضرورت کیوں؟

ٹریڈ یونین کی ضرورت سرمایہ داروں کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے پیش آتی ہے۔ سرمایہ داری نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ وسائلِ معاش چند افراد اور گروہوں کے قبضے میں آ جاتے ہیں اور باقی تمام قوم ان کی محتاج بن جاتی ہے۔ اگر مزدور کارخانے میں ملازمت نہیں کرے گا تو اسے اور کوئی

ذریعہ معاش ملنے کی امید نہیں۔وسائل معاش محدود ہیں' جو چند افراد اور حکومت کی سرکاری مشینری کے قبضے میں ہیں۔اب مزدور ایک انسان ہے جس کو اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنا ہے۔وہ لامحالہ یا تو کارخانہ دار کے ظلم و ستم برداشت کرے اور اس کی شرائط پر ملازمت کرے' یا زمیندار کے ظلم و ستم کو برداشت کرے اور اس کی شرائط پر کام کرے۔اسلام کے معاشی نظام کی بہت بڑی خصوصیت جو اسے سرمایہ داری نظام سے جدا کرتی ہے' یہ ہے کہ اس نے معاشی وسائل کی بہتات کا اہتمام کیا ہے' تاکہ ایک مزدور جسے ایک کارخانہ دار مناسب اجرت دینے پر تیار نہیں ہے' اس کو وہاں عزت نفس نہیں ملتی' وہ بڑے اطمینان سے اس ملازمت پر ٹھوکر مار دے اور دوسرا ذریعہ معاش اختیار کرلے۔اگر صحیح معنوں میں اسلام کا معاشی نظام نافذ ہو گا تو وہاں کوئی مزدور اس پر مجبور نہیں ہو گا کہ اگر کارخانہ دار کی ناجائز بات نہیں مانوں گا تو بھوکا مرجاؤں گا۔

سرمایہ داری نظام میں وسائل محدود ہیں اور وہ سب چند افراد کے قبضے میں ہیں۔مزدور جب ملازمت کرنے آتا ہے اور اس کے گھر میں فاقے ہو رہے ہیں تو اس وقت وہ صنعت کار کی سخت شرائط کو منظور کرلیتا ہے۔سرمایہ دار اس کی اس کمزوری کو جانتا ہے اور اس پر مزید ظلم و ستم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس ظلم و ستم سے بچنے کے لیے ٹریڈیونین وجود میں آتی ہے اور پھر ٹریڈیونین نہ صرف یہ حقوق منواتی ہے بلکہ ان حقوق کے حصول کے نام پر ایسے مظالم روا رکھتی ہے کہ صنعتی زندگی کو مفلوج بھی کر دیتی ہے اور طرح طرح کے ناجائز کاموں کا ارتکاب بھی کرتی ہے۔انھوں نے ظلم کیا تو یہ اس کا جواب ظلم سے دیتے ہیں۔وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا کا منظر سامنے آتا ہے کہ اللہ بعض ظالموں پر دوسرے ظالموں کو مسلط کر دیتا ہے۔(الانعام ۶: ۱۲۹) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صنعتی تعلقات میں خوشگواری نہ پہلے تھی نہ بعد میں وجود میں آتی ہے۔ٹریڈیونین کے آنے سے کچھ اور نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں' جھگڑے بڑھ جاتے ہیں۔کبھی تالہ بندی ہوتی ہے' کبھی اسٹرائیک ہوتی ہے' اور دونوں کے نتیجے میں صنعت مفلوج ہو جاتی ہے' معاشی ابتری ملک میں پھیل جاتی ہے۔مسائل کا یہ حل نہیں ہے۔نہ ٹریڈیونین اس کا حل ہے' نہ سرمایہ داری نظام۔اس کا واحد حل وہ اقتصادی نظام ہے جس کے اندر پیشوں کی آزادی ہو' محنت کا احترام ہو' وسائل معاش کی بہتات ہو۔

آجر اور مستاجر کے تعلقات کی بنیادیں

معاہدہ ملازمت: اجیر و مستاجر کے تعلقات اس وقت شروع ہو جاتے ہیں جب اسے ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔اس کے بارے میں قرآن کریم' احادیث نبوی ؐ اور فقہی تفصیلات سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ملازمت کا ایک معاہدہ طے پانا چاہیے' جس میں کام کی نوعیت' وقت کی مقدار' تنخواہ

اور تنخواہ کے علاوہ جو جو سہولتیں مستاجر دینے کے لیے تیار ہے ان کی وضاحت ' تعطیلات کی تفصیلات ' اوقاتِ کار ' مدتِ ملازمت ' عزل و نصب کے اختیارات ' معاہدہ کو فسخ کرنے کی تفصیلات طے ہونا ضروری ہیں ۔ اجیر و مستاجر کے درمیان اس طرح کے معاہدے کو اجارہ کہتے ہیں ۔ اگر یہ امور طے نہ ہوں تو فقہا یہ کہتے ہیں کہ ایسا اجارہ فاسد ہے ۔ اس کو فسخ کرنا شرعاً واجب ہے اور ایسا اجارہ کرنے والے دونوں گناہ گار ہیں ۔

قرآن کریم میں اس کی بنیادیں موجود ہیں ۔ سورۃ القصص آیت نمبر ۲۷ میں حضرت موسیٰ ؑ کے واقعے سے رہنمائی ملتی ہے ۔ حضرت شعیب ؑ کی دونوں صاحبزادیوں میں سے ایک نے اپنے باپ کو مشورہ دیا کہ آپ ان کو گھر کے کام کاج کے لیے ملازم رکھ لیجیے ' تو حضرت شعیب ؑ نے حضرت موسیٰ ؑ سے فرمایا: میرا ارادہ یہ ہو رہا ہے کہ میں ان دو لڑکیوں میں سے کسی ایک کا نکاح تم سے کر دوں ' اس شرط پر کہ تم میرے ہاں آٹھ سال تک ملازمت کرو گے ۔ میرے گھر کا کام کاج کرو گے ' کیونکہ گھر میں کوئی اور مرد کام کرنے والا نہیں تھا ۔ کام متعین تھا ' جگہ متعین تھی ' اس کی مدت بھی آٹھ سال مقرر ہو گئی تھی ۔ آگے فرمایا: اگر تم نے دس سال پورے کر دیے تو تمھاری طرف سے احسان ہو گا ۔ اور میں تمھیں کوئی ایسا کام نہیں کہوں گا جس سے تمھیں مشقت اور تکلیف لاحق ہو ۔ تم مجھے ان شاء اللہ نیکوکار پاؤ گے ۔ مستاجر کیا کہہ رہا ہے: اجرت بتا رہا ہے ۔ اجرت کیا ہے: اپنی بیٹی نکاح میں دے دوں گا ۔ (اس زمانے میں یہ شرعاً جائز تھا) ۔ کام کیا ہے: گھر کا کام کاج ۔ مدت آٹھ سال کی ہے ' اس سے زیادہ ایک دو سال اور لگا دو گے تو تمھارا مزید احسان ہو گا ۔ اپنے اوپر ذمہ داری لے رہا ہے کہ میں تم پر ایسا کام نہیں ڈالوں گا جو تمھارے لیے مشقت اور تکلیف کا باعث ہو اور تم مجھے جو معاہدہ میں تم سے کر رہا ہوں اس کی پابندی کرنے والا پاؤ گے اور بھی جو باتیں ایک نیک انسان سے متوقع ہوتی ہیں ان شاء اللہ وہ تم کو حاصل ہوں گی ۔ یہ مستاجر کی طرف سے ایجاب ہے ۔ اب اجیر جواب دیتا ہے ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یہ معاملہ میرے اور تمھارے درمیان طے پا گیا ہے ۔ ان دو مدتوں میں سے جو بھی مدت پوری کروں ' میرے اوپر کوئی زور یا جبر نہیں ہو گا ۔ یعنی مجھے اختیار ہو گا کہ ان دونوں میں سے جو بھی مدت چاہوں اختیار کروں ' اس سے کم نہیں کروں گا ۔ اور جو کچھ میں اور آپ بات کر رہے ہیں اور معاہدہ ملازمت طے پا رہا ہے اس کے اوپر ہم اللہ تعالیٰ کو نگران مقرر کرتے ہیں ۔ کوئی بدنیتی ' بددیانتی کسی ایک کی طرف سے سرزد ہو گی تو وہ ہر انسان کے عمل سے باخبر ہے اور ہمارا احتساب اسی کے سامنے ہونے والا ہے ۔

صلاحیت : ملازم کی صلاحیتوں کے بارے میں ہمیں دو جگہوں پر معیار ملتے ہیں ۔ ملازم اور

مزدور دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک ملازمین وہ ہوتے ہیں جو انتظامیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ایک وہ مزدور ہوتا ہے جس کا کام محنت سے ہوتا ہے۔انتظامی ملازمین کے لیے معیار قرآن کریم نے حضرت یوسف ؑ کے واقعے میں دیا ہے۔یوسف ؑ سے بادشاہ مصر نے کہا: ہمارے نزدیک تم امانت دار ہو' معتز ہو۔جب حضرت یوسف ؑ نے دیکھا کہ قحط سے بچانے کا کوئی اور انتظام بظاہر نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں اپنی خدمات پیش کروں' مجبوراً انھوں نے اپنے آپ کو پیش کیا' اور فرمایا: آپ مجھے خزائن الارض پر مقرر فرما دیجیے۔زمین کے تمام خزانوں پر جس میں زرعی پیداوار بھی ہے۔اس کا مطلب میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ وزیر خزانہ اور وزیر تجارت و زراعت مجھے بنا دیجیے۔کیوں؟ میرے اندر دو صفتیں ہیں: ایک میں حفاظت کرنے والا ہوں' دوسرے یہ کہ میں امانت دار ہوں۔تمام امور اور احوال کی' زرعی پیداوار کی' اور جو راز اور انتظامی امور مجھ سے متعلق ہوں گے ان سب کی میں حفاظت کرنے والا ہوں۔ان تمام کاموں کے لیے علم کی ضرورت ہے' تو الحمدللہ مجھے علم کی دولت بھی حاصل ہے کہ میں جانتا ہوں کہ کون سے موقع پر کتنا مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ایک وزیر خزانہ کو اپنا کام سنبھالنے کے لیے جن دو اہم اوصاف کی ضرورت تھی وہ حضرت یوسف ؑ نے پیش کیے۔

دوسری قسم کے ملازم محنت کار ہوتے ہیں۔ان کے لیے بھی حضرت موسیٰ ؑ کے واقعہ میں دو وصف بیان فرمائے گئے ہیں۔صاحبزادی نے کہا: اباجان' آپ اس کو گھر میں ملازم رکھ لیں۔سب سے اچھا اجیر وہ ہے جو قوی ہو اور امانت دار ہو۔قوی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو کام اس سے متعلق ہے اس کی پوری اہلیت' صلاحیت اور جسمانی قوت اس کے اندر موجود ہو۔اور امانت دار ہونے کا وصف بھی موجود ہو۔

معلوم ہوا کہ اسلام میں ملازمت اور مزدوری میں کوٹے کا تصور نہیں ہے۔یہ نہیں ہے کہ نااہل آدمی اگر یوں کہے کہ "کیوں کہ میں فلاں شہر میں پیدا ہوا تھا اس واسطے مجھے فلاں ملازمت پر ضرور لگائیے ورنہ آپ ظالم ہوں گے"۔اس کا کوئی تصور اسلام میں نہیں ہے۔یہاں اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر فیصلے ہوں گے۔اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی ملازم اہلیت اور صلاحیت میں ناقص ہے تو پھر یہ ایک ناانصافی کی بات ہے کہ وہ پھر بھی اسی جگہ ملازمت پر اصرار کرے۔دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کام کو چھوڑ دے۔

محنت کا احترام : محنت کا احترام صنعتی تعلقات میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ہمارے معاشرے میں یہ تصور پتا نہیں کیسے آیا کہ مزدور حقیر ہے اور مستاجر باعزت۔درحقیقت یہ تصور ہندو رسم و رواج کا حصہ ہے۔ان کے یہاں طبقات تھے' جوتے گانٹھنے والا موچی اور چمار کہلاتا تھا' بیت

الخلا صاف کرنے والا بھنگی کہلاتا تھا۔ اسلام میں یہ تصورات نہیں ہیں۔ حضرت داؤد ؑ نے لوہار کا کام کیا' حضرت ادریس ؑ نے بڑھئی کا کام کیا' تمام انبیا ؑ نے بکریاں چرائیں۔ رسول اللہ ؐ نے مسجد نبوی کی تعمیر میں پتھر ڈھوئے' غزوہ خندق کے موقع پر زمین کھودی۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ آپ ؐ جب گھر میں ہوتے تھے اپنے جوتے کو گانٹھ لیتے تھے' اپنے کپڑے کو سی لیتے تھے' اپنی بکریوں کا دودھ دوھ لیتے تھے۔ یہ تمام کام رسول اللہ ؐ نے کر کے بتلائے کہ ان میں سے کسی کام میں نہ ذلت ہے نہ وقار و عزت کے خلاف کوئی بات ہے' بلکہ یہ تو مکارم اخلاق ہیں۔

ایک انصاری آپ ؐ کے پاس تشریف لائے اور کہا: میرے پاس مال کچھ بھی نہیں ہے' کچھ پیسے دے دیجیے۔ آپ ؐ نے فرمایا: گھر میں تمھارے پاس کچھ تو ہو گا۔ کہا: ہاں ایک ٹاٹ ہے' جس کے کچھ حصہ کو ہم اوڑھ لیتے ہیں اور کچھ حصے کو بچھا لیتے ہیں' اور ایک پیالہ ہے۔ فرمایا: دونوں لاؤ۔ آپ ؐ نے اسے نیلام کرایا' ۲ درھم میں وہ فروخت ہوئے۔ آپ ؐ نے کہا کہ جاؤ اس میں سے ایک درھم تو اپنے گھر والوں پر خرچ کرو۔ اور ایک درھم سے کلہاڑی کا پھل خریدا اور لکڑی آپ ؐ نے اپنے دست مبارک سے لگائی' اور فرمایا' جاؤ "لکڑیاں کاٹو اور فروخت کرو" اور اس سے اپنا پیٹ پالو۔ آیندہ کے لیے جمع کرو اور ۱۵ دن تک سامنے نہ آنا۔ چنانچہ ۱۵ دن کے بعد آئے تو ۱۰ درہم کما چکے تھے۔ پھر آپ ؐ نے اس کا طریقہ بتایا' کتنے پیسے خرچ کرو' کتنے پس انداز کرو' کتنے فلاں کام میں لگاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا کام کروا دیا۔ پھر آپ ؐ نے کسب حلال کی فضیلت بیان فرمائی کہ "سب سے بہتر رزق وہ ہے جو انسان اپنے ہاتھ کی کمائی سے حاصل کرتا ہے"۔ چاہے جھاڑو دے کر حاصل ہو' چاہے بیت الخلا صاف کر کے حاصل ہو' چاہے ہوٹلوں میں بیرا بن کر حاصل ہو۔ اس سے عزت میں کوئی کمی نہیں آتی۔

ایک اور بڑی اہم بات ہے۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں' رسول اللہ ؐ نے فرمایا: جس شخص نے اس حالت میں شام کی کہ وہ کاموں سے تھک کر چور ہو گیا ـــ یہ نہیں بتایا کہ کون سے کام' ظاہر ہے کہ وہ دنیا کے کام ہیں' تجارت کے کام ہیں' مزدوری کے کام ہیں ـــ تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اب اندازہ کیجیے' محنت کا کتنا احترام ہے' محنت کی کتنی عظمت ہے۔

تاجر کے بارے میں فرمایا: وہ تاجر جو سچا بھی ہے اور امانت دار بھی ہے' اس کا حشر آخرت میں انبیا کرام' صدیقین' اور شہدا کے ساتھ ہو گا۔ اللہ رب العالمین یہ فرما رہے ہیں کہ جو تاجر صدق و امانت میں کامل ہو وہ آخرت میں آنحضرت ؐ اور انبیا کرام ؑ کے ساتھ ہو گا۔ یہ معمولی اعزاز نہیں ہے' بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور ایسا تاجر امانت دار نہیں ہو سکتا جو اپنے مزدور اور ملازم کے ساتھ ناانصافی کرتا

ہو' خیر خواہی نہ کرتا ہو' ہمدردی نہ کرتا ہو۔ اس لیے محنت کا احترام صنعتی تعلقات کی بہتری کے لیے اسلام کی نظر میں ایک بڑی اہم بنیاد ہے۔

دکاندار نے 'صنعت کار نے آپ کا وقت خریدا ہے 'محنت خریدی ہے' اور آپ نے فروخت کی ہے۔ یہ تصور کہیں نہیں ہوتا ہے کہ کیونکہ یہ خرید رہا ہے اس لیے یہ اعلیٰ مرتبے کا ہے اور کیونکہ یہ فروخت کر رہا ہے تو ادنیٰ مرتبے کا ہے۔ آپ میں اور صنعت کار میں کسی کو اونچا نیچا ہونے کا حق نہیں ہے۔

ادائے حق: محنت کے احترام کے ساتھ ساتھ ادائے حقوق تیسری بنیاد ہے۔ قرآن کریم اور سیرت نبوی ؐ کی تعلیمات میں حق والوں کو خطاب کر کے یوں نہیں کہا گیا کہ تم اپنا حق وصول کر لو۔ یہ اور بات ہے کہ اپنا حق وصول کرنے کے لیے جدوجہد کی بھی اجازت ہے۔ اس کے بجائے یہ ترغیب دی گئی ہے کہ تم دوسروں کے حقوق ادا کرو۔ حکم یہ ہے کہ تم امانتیں ان لوگوں کو پہنچا دو جن کی وہ امانت ہیں۔ اس حکم پر عمل ہو جائے تو دوسرے پر خود بخود عمل ہو جائے گا' کیونکہ ایک کا حق دوسرے کا فریضہ ہے۔ یہ سرمایہ داری نظام کی لیک بلا ہے کہ حقوق مانگنے میں تو سب ایک دوسرے سے آگے ہیں' اور ادائے حقوق کا کوئی ذکر بھی نہیں ہوتا۔ مسلم معاشرے میں بھی ایک بھیڑ چال ہے۔ پروپیگنڈہ کے باعث اور موجودہ معاشی نظام کی وجہ سے یہ ذہن بنتا ہے کہ مزدور کا ہر مطالبہ مبنی بر حق ہے۔ لیکن کیا صنعت کار اور تاجر کے حقوق نہیں ہیں۔ اللہ رب العالمین کے بندے دونوں ہیں اور مزدور بھی ہیں۔ مزدور کے حقوق' سرمایہ دار کے فرائض ہیں اور سرمایہ دار کے حقوق مزدور کے فرائض ہیں۔ قرآن کریم نے ادائے حقوق کا بہت اہتمام کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قرآن کریم میں ہے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ "ویل" کہتے ہیں بربادی کو' عذاب کو' اور مفسرین نے لکھا ہے کہ جہنم کی ایک وادی کا نام ویل ہے' جو اتنی گہری ہے کہ اگر اوپر سے پتھر پھینکا جائے تو چالیس سال کے بعد اس کی تہ میں پہنچے گا۔ مطفف کہتے ہیں ناپ تول میں کمی کرنے والے کو۔ دودھ والا دودھ ناپتا ہے اور اپنا کرتب دکھاتا ہے' ایک کلو کے بجائے پونا کلو دودھ دیتا ہے۔ کپڑا ناپنے والا گزوں سے ناپتا ہے اور اپنی مہارت دکھاتا ہے اور ہر گز کے اندر سے ایک دو انچ بچا لیتا ہے۔ یہ تو ناپ میں کمی ہوئی۔ تول میں کمی وہی ہے جو ہمارے پاکستانی تاجر بکثرت کرتے ہیں' یعنی ڈنڈی مارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے عذاب ہے' بربادی ہے' یا جہنم کی وہ وادی مقرر ہے (اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے)۔ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی صفت بیان کی الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ، جب دوسروں سے ناپ کر چیز

لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں' لیکن وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ' جب ناپ کر دوسروں کو کوئی چیز دیتے ہیں اور وزن کر کے کوئی چیز دیتے ہیں تو ڈنڈی مارتے ہیں۔ اشارہ اس جانب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی زبردست حماقت کی بات ہے۔ آدمی یہ چاہے کہ جب دوسروں کو دے تو ناپ تول میں کمی کر کے دے' اور دوسروں سے پورا پورا ملے' ایسا نہیں ہو گا۔ جب دودھ والا ڈنڈی مارے گا اور دوا لینے کے لیے کیمسٹ کے پاس جائے گا تو وہ بھی ڈنڈی مارے گا' اور کیمسٹ جب ڈاکٹر کے پاس جائے گا تو وہ بھی اس کی جیب کاٹے گا۔ اور ہر ایک خوش ہے کہ میں نے اس سے پانچ دس روپے بچا لیے۔ بچایا وچایا کچھ نہیں' جتنا بچایا تھا اس سے زیادہ چھن گئے۔

میرے والد ماجد مفتی محمد شفیع عثمانی" فرمایا کرتے تھے کہ جو حکم خریدار اور اس کے گاہک کا ہے' بالکل وہی حکم اجیر اور مستاجر کے درمیان ہے۔ اجیر نے تنخواہ پوری پوری لے لی۔ ڈیوٹی اس کی آٹھ گھنٹے کی تھی' اس نے آدھ گھنٹہ چائے پینے میں گپ شپ کرنے میں' ذاتی خطوط لکھنے میں' اخبار پڑھنے میں گزار دیے۔ یہ بھی مطفف ہے۔ کیونکہ اس نے پیسے پورے لے لیے' مال تجارت پورا نہیں دیا۔ سرکاری ملازم ہو یا افسر ہو' کارخانہ کا منیجر ہو یا کلرک۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت شعیب ؑ کی قوم پر جو عذاب آیا تھا ان کا جرم کیا تھا۔ یہی تطفیف تو ان کا جرم تھا۔ وہ قوم ناپ تول میں کمی کیا کرتی تھی۔ قرآن میں اس کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے کہ قوم کو کس طریقے سے برباد کیا گیا۔

ایک بات اور ہے' جو کہیں اپنے درجے میں فرض ہے' کہیں مستحب ہے' اور وہ یہ ہے کہ سرمایہ دار مزدور کی خیر خواہی کرے اور مزدور سرمایہ دار کی خیر خواہی کرے۔ رسول اللہ ؐ کا ارشاد ہے' الدّین النصیحہ' پورا دین نصیحت ہے' ملازم اور مزدور کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ اس کے حقوق کا لحاظ رکھو۔ اور مزدور بھی پابند ہے کہ مالک اور کارخانہ دار کے ساتھ خیر خواہی کرے۔ یہ خیر خواہی مزدور میں جب تک پیدا نہیں ہوگی' جب تک مزدور کا دل اس میں شامل نہیں ہو گا۔

(نیشنل لیبر فیڈریشن کے ایک سیمینار میں کی گئی تقریر)

اخبار امت

ا۔انڈونیشیا: اسلامی لہر

انڈونیشیا اپنی ۱۹ کروڑ سے زیادہ آبادی کے حساب سے سب سے بڑا مسلمان ممالک ہے، جن میں ۸۷ فی صد مسلمان ہیں۔ مسلمان ہر قسم کے ہیں، خصوصاً جاوا کے، جہاں آبادی کی اکثریت ہے، بعض مسلمانوں کے عقائد و رسومات دیکھ کر کٹر سلفی شاید ان کو مسلمان ماننے سے بھی انکار کر دیں۔ لیکن انڈونیشین مسلمانوں کی اسلام سے محبت اور احیائے اسلام سے وابستگی کی تاریخ طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی: سماترا میں دارالاسلام کی تحریک (جو کچل دی گئی)، ماشومی پارٹی اور ڈاکٹر ناصر (جو وزیر اعظم بھی رہے)، اور نہضۃ العلما، اس وابستگی کے چند تابندہ نشانات ہیں۔ مگر سوہارتو دور میں کیمونسٹ پارٹی کا غلبہ، ۱۹۶۶ میں ان کے فوجی انقلاب کی ناکام کوشش، اور فوج کا جوابی انقلاب، سوہارتو کے تقریباً تیس سالہ دورِ حکومت میں پنچ شیلا کی حکمرانی اور کنٹرولڈ جمہوریت جس میں فوج پارلیمنٹ کی ۲۰ فی صد سیٹوں کی حق دار ہے، ان عوامل نے بظاہر اسلامی احیا اور جماعتوں کو بہت پیچھے ڈال دیا۔

ان تمام واقعات کے باوجود، ہفت روزہ گارجین (۲ اپریل ۹۵) میں مشہور فرانسیسی اخبار لی مانڈ کی رپورٹ کے مطابق "ملک کے طول و عرض میں اسلام کا احیا صاف دیکھا جاسکتا ہے: حجاب پہننے والی عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور نئی مساجد تعمیر ہورہی ہیں، رمضان کا اہتمام ہر سال بڑھتے ہوئے ذوق و شوق سے ہوتا ہے، اور دفاتر میں لوگوں کو اپنا کام کرانے کے لیے نماز ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ حج بھی زیادہ کثرت سے ہورہا ہے---اور---یہ مظاہر دیہاتوں سے زیادہ شہروں میں، اور نچلے طبقوں سے زیادہ خوش حال متوسط طبقہ میں دیکھے جاسکتے ہیں"۔

نہضۃ العلما کا اپنا مقام ہے۔ اس کے ۳۶ لاکھ ممبر ہیں، جن میں علما بھی ہیں، دانش ور اور عوام بھی۔ اس کی طاقت کا اصل سرچشمہ ۸ ہزار دینی مدارس ہیں۔ ۵۳ سالہ عبدالرحمان واحد، جو ۱۹۸۴ سے نہضۃ العلما کے سربراہ ہیں، اور جن کے دادا نے ۱۹۲۶ میں اس تنظیم کی بنیاد رکھی، حکومت کی

سرگرم مخالفت کے باوجود تیسری بار سربراہ منتخب ہوئے ہیں' اگرچہ بعض وزرا ان کے حامی بھی ہیں۔ وہ اپنی پارٹی میں بہت مقبول ہیں۔ واحد کی شخصیت گوناگوں عناصر کا مرکب ہے' جن کا احاطہ تفصیل کا محتاج ہے۔ وہ خود کو قدامت پسند کہتے ہیں' الازہر میں تعلیم پائی ہے لیکن اس سے نفرت کرتے ہیں' اسرائیل سے تعلقات استوار کرنے کے حامی ہیں اور وہاں کا دورہ کر چکے ہیں۔ نہضۃ العلما کا موقف سیاست سے دور رہنے کا ہے' لیکن وہ برابر دخل دیتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک ڈیموکریٹک فورم بنایا ہے۔ حکومت پر تنقید بھی خوب کرتے ہیں' جو انڈونیشیا میں ایک خطرناک کام ہے۔ دوسرے بڑے اسلامی گروپ 'اکمی (ICMI) مجلس دانش وران انڈونیشیا' سے ان کی ٹھنی رہتی ہے۔ اکمی کی بنیاد وزیر ٹرانسپورٹ و ریسرچ' جیبی نے رکھی ہے' جو صدر سوہارتو کے بہت قریب اور ان کے آلۂ کار شمار ہوتے ہیں' اور قیاس آرائی ہے کہ شاید ان کے جانشین بھی ہوں۔ اکمی کا مقصد ملازمتوں میں مسلمانوں کو ان کا جائز مقام دلوانا ہے' جہاں عیسائی چھائے ہوئے ہیں۔

صدر سوہارتو نے حال ہی میں فوج کے کمانڈر کے طور پر جنرل ہارتونو کو مقرر کر کے ایک اور سنسنی پیدا کر دی ہے۔ جنرل ہارتونو نے واحد کے انتخاب کی مخالفت کی تھی' اور وہ جیبی کے آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ باعمل مسلمان بھی ہیں۔ ان کی تقرری کے بعد جب ان کو فون کیا گیا تو وہ تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔ ان کا گھر مدورا جزیرہ میں ہے' جو اسلامی اثرات کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ فوج میں عیسائی (جو آبادی کا صرف ۹ فی صد ہیں) چھائے ہوئے ہیں' یہ سیکولر مگر عیسائی ڈچ آقاؤں کا "تحفہ" ہے۔ جب جنرل ہارتونو کو فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا تو' لی مانڈ کے الفاظ میں "ساری غیر مسلم آبادی ہل کر رہ گئی: کیا انڈونیشیا کی اعلیٰ فوجی کمان کلیتاً اسلامی افسروں کے ہاتھ میں آگئی ہے؟" (ماخوذ ہفت روزہ گارجین' ایشیا ویک' فار ایسٹرن اکنامک ریویو) (ابو احمد)

۲- ایران: امریکہ کی زد میں

کیا خلیج میں ایک اور خونیں جنگ کے لیے میدان ہموار کیا جا رہا ہے!

صدر کلنٹن نے' ۴ اپریل کو سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے' ایران کے خلاف سخت ترین اقدامات کی دھمکی دے دی ہے۔ کہنے کو تو مقصد اسے ایٹمی طاقت بننے اور دہشت گردی کی مدد کرنے سے روکنا ہے' لیکن حقیقت میں سارا غیظ و غضب اس لیے ہے کہ ایران مضبوطی سے اسرائیل کی مخالفت پر تلا ہوا ہے' اور امریکہ کے منصوبوں کے مطابق ہونے والے ان نام نہاد عرب اسرائیل امن معاہدوں کا شدید مخالف ہے جن کا مقصد فلسطینیوں کو فلسطینیوں کے ہاتھوں کچلوانا ہے۔ چنانچہ کلنٹن

نے صاف کہہ دیا ہے کہ "ایران مشرق وسطیٰ کے عدم استحکام کا سب سے بڑا سبب اور امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے"۔

کلنٹن انتظامیہ میں ایران دشمن پالیسی کے معمار' مارٹن انڈائنک کا کہنا ہے کہ صدر رفسنجانی نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ایران کا ہدف اسرائیل کا خاتمہ ہے۔ کلنٹن نے یہودی خواتین کے کنونشن کے سامنے اعلان کیا: "امریکہ کی پالیسی کا ہدف بالکل واضح ہے: جو مشرقِ وسطیٰ میں امن کے مخالف ہیں' ان کو کمزور' بے سہارا اور یکہ و تنہا کر کے چھوڑنا"۔ مزید بر آں' ورجینیا یونی ورسٹی کے پروفیسر ہیرپ کہتے ہیں کہ "کانگریس' میڈیا اور مختلف تھنک ٹینک' اپنے اختلافات کے باوجود' اس بات پر متفق ہیں کہ ایران امریکہ کا دشمن عظیم ہے"۔

ایران نے غیر محدود مدت کے لیے ایٹمی اسلحے کے عدم پھیلاؤ کے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے' حالانکہ اس نے اس سے پیش تر محدود مدت کے معاہدہ پر دستخط کیے تھے۔ یہ معاہدہ اپریل ۹۵ میں نیویارک میں ہونے والی کانفرنس میں ہونا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس معاہدے کا کوئی حاصل نہیں' سوائے فی الوقت ایٹمی اسلحے سے لیس امریکہ' اسرائیل اور بھارت جیسے ممالک کی برتری قائم رکھنے کے۔ ایران کے اس موقف نے مغربی طاقتوں میں' خاص طور پر امریکہ میں' جو اسرائیل کا سرپرست اور ایٹمی ٹیکنالوجی پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لیے اس معاہدے کا سب سے بڑا علمبردار ہے' غم و غصے کی لہر دوڑا دی ہے۔ چنانچہ اس وقت اسی لیے ایران امریکی ڈپلومیسی کا مرکزی ہدف بن گیا ہے۔ صدر کلنٹن کے ایران کے خلاف اقدامات کے اعلان سے پیش تر وزیر خارجہ کرسٹوفر اور وزیر دفاع پیری اسی قسم کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔

نیویارک ٹائمز (جنوری ۹۵) لکھتا ہے کہ ایران پانچ سال کے اندر اندر ایٹمی اسلحہ بنا سکتا ہے' اور اس کا ایٹمی پروگرام اسرائیل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسرائیل نے الزام لگایا ہے کہ ایران نے دھمکی دی ہے کہ وہ اپنے ایٹمی اسلحے کو اسرائیل کے خلاف استعمال کرے گا۔ ایران نے تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ دھمکی اسرائیل کی من گھڑت ہے۔ امریکی وزیر دفاع ولیم پیری نے بھی اپنے دورہ اسرائیل میں کہا ہے کہ ایٹمی اسلحہ بنانے اور دہشت گردی کی وجہ سے ایران امن کے لیے خطرہ ہے۔ حال ہی میں امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر نے برملا کہا ہے کہ امریکہ ایران کو ایٹمی اسلحے سے باز رکھنا اپنا سب سے بڑا ٹارگٹ سمجھتا ہے۔ یہ بیانات اسرائیل کی دھمکیوں کی بازگشت کی حیثیت رکھتے ہیں' جس کا ارادہ ایران کی ایٹمی تنصیبات تباہ کرنے کا ہے' جس طرح اس نے ۱۹۸۱ میں عراق کا ایٹمی اسلحہ تباہ کر دیا تھا۔ پیری نے مزید کہا ہے کہ امریکہ اسرائیل کے اندیشوں میں برابر کا شریک ہے' لہٰذا

وہ اپنی تمام تر کوششیں ایران کو ایٹمی ٹیکنالوجی سے باز رکھنے پر مجبور کرنے کے لیے صرف کرے گا۔

ایران کا اصرار ہے کہ اس کا ایٹمی پروگرام غیر عسکری اور پُرامن مقاصد کے لیے ہے۔ ایران نے چونکہ پہلے معاہدے پر دستخط کیے تھے' اس لیے اس کی ایٹمی تنصیبات انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے دائرہ تفتیش میں شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایجنسی کو ابھی تک ان تنصیبات میں کسی ایسی چیز کا سراغ نہیں ملا جس کا مغرب پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔

مگر امریکی ذرائع کا الزام ہے کہ ایران ایٹمی اسلحے کی تیاری کے لیے خاص قسم کے آلات خرید رہا ہے۔ علاوہ ازیں وہ سابق سوویت یونین کی ریاستوں اوکرائیا' قازقستان' ترکمانستان اور آذربائیجان وغیرہ سے ایٹمی ٹیکنالوجی کے ماہرین کو اجرت پر بھی رکھ رہا ہے۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ ایران شمالی کوریا میں اپنا سرمایہ بھی اسی لیے لگا رہا ہے کہ اس کے بدلے میں کوریا سے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کر سکے۔ دونوں ممالک کے درمیان گہرے روابط موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایران نے کوریا سے ۔۔ اکی تعداد میں راکٹ بھی خریدے ہیں اور اس سے No Dong 150 راکٹوں کا مطالبہ بھی کیا ہے جن کی مار چھ سو میل سے زیادہ ہے۔

جس چیز نے امریکہ کے پیچ و تاب میں مزید اضافہ کیا ہے وہ ایران کا ۱۹۹۴ میں روس کے ساتھ ایٹمی تعاون کا معاہدہ ہے۔ امریکہ خود ایران کو ایٹمی ٹیکنالوجی برآمد کرنا بند کر چکا ہے۔ ۱۹۹۲ میں جب ایران نے ارجنٹائن سے ہتھیار خریدنے کی کوشش کی تو بھی امریکہ نے مداخلت کر کے ارجنٹائن کو ہتھیار دینے سے روک دیا۔ روس اور ایران کے مذکورہ بالا معاہدے کے تحت ایران بوشہر کے علاقے میں ایٹمی طاقت کے استعمال کے لیے ورکشاپ قائم کرنا چاہ رہا ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں ۱۹۷۹ میں شاہ کی حکومت کے خاتمے اور اسلامی انقلاب کی آمد کے دوران جرمنی نے اپنی تعمیرات روک دی تھیں' اور ۱۹۹۲ میں امریکہ کے دباؤ میں آکر انھیں ختم کر دیا تھا۔ اسی ورکشاپ کی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے ایران نے روس کے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ روسی وفد کے ایرانی ایٹمی ورکشاپ کے دورہ کے بعد سے اسرائیل اور ایران کے درمیان مسلسل زبانی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔

ایران کے ایٹمی پروگرام کے خاتمے کے لیے امریکہ کیا کر سکتا ہے؟ وہ ایرانی تیل کا سب سے بڑا خریدار ہے' اور اسے اپنے ہاں درآمد کرنا بند کر سکتا ہے۔ صدر کلنٹن نے اس کا اشارہ دے دیا ہے۔ اس طرح سے ایران کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ (۵ء۷ ۶ء۳) بلین ڈالر ختم ہو کر رہ جائے گا۔ ایران اگر دوسری کمپنیاں تلاش کرے گا تو اسے نسبتاً سستے داموں پٹرول بیچنا پڑے گا۔ دوسری طرف امریکہ ماسکو پر دباؤ ڈال سکتا ہے کہ وہ ایران کے ساتھ اپنے ایٹمی معاہدے پر نظر ثانی کرے۔ روس

اس وقت شدید قسم کے مالی بحران میں مبتلا ہے، اور مجبور ہو کر واشنگٹن کے آگے گھٹنے ٹیک سکتا ہے۔ لیکن امریکہ کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ اس قسم کی تدابیر سے مسئلے کا حل نہیں نکالا جا سکتا۔

پروفیسر ہیرپ کے بیان کے مطابق: امریکہ کی ۲۴ ماہ کی کوششوں کا حسب دل خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوا ہے۔ امریکہ کے بیشتر الزامات غلط ہیں۔ ایران کسی ملک میں بھی عدم استحکام کا ذمہ دار نہیں۔ ارجنٹینا نے یہودی مرکز میں بم کا دھماکہ کر کے ۹۵ یہودیوں کی ہلاکت کا الزام ایرانی سفارت کاروں پر لگایا، مگر پھر خاموشی سے اس الزام کو دفن کر دیا۔ ایران کی جنگی صلاحیت کسی پڑوسی ملک کے لیے خطرہ نہیں۔ ایران کے دفاعی اخراجات ایک دو ارب ڈالر کے درمیان رہے ہیں، اور فی کس ان کا تناسب اس کے تمام پڑوسی ممالک سے کم ہے۔ اس کے برعکس امریکہ نے اب تک ایران کے اثاثوں کا مسئلہ حل نہیں کیا ہے جو اس نے ۱۶ سال پہلے ضبط کیے تھے۔ نہ اس نے اس ایربس کے مسافروں کے لیے کوئی ہرجانہ دیا ہے جو اس نے اگست ۸۸ میں مار گرائی تھی۔

اصل سوال تو یہ ہے کہ کیا محترمہ بے نظیر کی حکومت، جو امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں فرنٹ لائن ریاست بننے کے لیے اپنی خدمات پیش کر چکی ہے، ایرانی "دہشت گردی" کے خلاف بھی امریکی مقاصد کے لیے سرگرم کار ہوگی؟ (ماخوذ: القضایا الدولیہ، اسلام آباد، 'World 1' دسمبر ۱۹۹۴) (خدیجہ ترابی)

رسائل و مسائل

شادی بیاہ کا مسنون طریقہ

شادی بیاہ کے موقع پر بہت سی رسوم بھی ادا کی جاتی ہیں۔ آپ یہ بتائیں کہ قرآن و حدیث کے احکام کی روشنی میں شادی بیاہ کیسے کیا جائے اور اس کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

۱۔ نکاح عِفّت و پاک دامنی کے تحفظ کا ذریعہ ہے، حکم خداوندی اور سنّت رسول ؐ ہے، اور نسلِ انسانی کی بقا کا سبب ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ وَاَنكِحُوا الْاَيَامٰى مِنكُمْ 'اے مسلمانو، غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی شادی کا انتظام کرو۔

رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے: نوجوانو، تم میں سے جو نکاح کی استطاعت رکھتے ہوں وہ شادی ضرور کرلیں اس لیے کہ نکاح نظر اور شرمگاہ دونوں کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہے (بخاری و مسلم)۔

۲۔ رشتے کے انتخاب میں مالی حیثیت، معاشرتی حیثیت، تعلیم، خاندانی تعلق اور حسن کو ملحوظ رکھنا بھی جائز ہے، بلکہ مناسب اور بہتر بھی ہے۔ لیکن ترجیح لازمی طور پر حُسنِ عقیدہ، حُسنِ کردار اور حسنِ اخلاق ہی کو دینی چاہیے۔ اپنی اولاد کو بدکردار شخص کے حوالے کرنا دراصل اسے آگ میں جھونکنے کے مترادف ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: قُوْٓا اَنفُسَكُمْ وَاَهْلِيكُمْ نَارًا 'اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں (رشتہ داروں) کو آگ سے بچاؤ۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے: کسی عورت سے شادی چار چیزوں کی وجہ سے کی جاتی ہے: مال، معاشرتی حیثیت، خوبصورتی اور دین داری، تم دین دار عورت کو حاصل کرنے کی کوشش کرو (بخاری و مسلم)۔

رشتے کے انتخاب کے وقت لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں یعنی چہرے کو۔ (ابو داؤد)

۳۔ پیغام نکاح اور منگنی کی مروجہ رسوم کی ضرورت نہیں ہے۔ زبانی یا بذریعہ خط و کتابت معاہدہ کافی ہے۔ حضرت علی ؓ نے خود ہی زبانی طور پر حضرت فاطمہ ؓ کا رشتہ مانگا تھا۔ البتہ لڑکا یا اس کا کوئی سرپرست منگنی کے موقع پر لڑکی کو حسب توفیق کوئی تحفہ دینا چاہے تو اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے

بلکہ یہ باہمی محبت کا ایک موثر ذریعہ ہے ۔ اگر منگنی لڑکے نے توڑی ہو تو اپنے دیے ہوئے تحفوں کو واپس مانگنا اخلاقاً معیوب ہے۔ لیکن اگر منگنی لڑکی والوں کی جانب سے توڑی گئی ہو تو لڑکا اپنے تحفوں کو واپس مانگ سکتا ہے ۔

۴۔ فخر و نمایش کے لیے بڑی برات کا اہتمام کرنا خلاف سنت ہے ۔ بعض علاقوں میں برات کو کھانا کھلانے کے لیے لڑکے والوں سے رقم طلب کی جاتی ہے ۔ فقہا نے اسے رشوت سے تشبیہ دی ہے جسے واپس دینا لازم ہے ۔ بعض علاقوں میں لڑکی کا سرپرست اپنے لیے بھاری رقم طلب کرتا ہے ۔ یہ تو آزاد عورت کو بیچنے کے مترادف ہے اور ممنوع ہے ۔ بعض علاقوں میں لڑکی والوں پر یہ شرط عائد کی جاتی ہے کہ برات کو فلاں قسم کا کھانا لازماً کھلایا جائے گا ۔ یہ بھی غیر اسلامی اور غیر ضروری رسم ہے جس کی وجہ سے لڑکی والوں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور لڑکیوں کی شادیاں کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ اس رسم کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے ۔ البتہ اگر لڑکی والے ' اپنی حیثیت اور اپنی استطاعت کے مطابق اپنی مرضی سے ' بغیر کسی سابقہ شرط کے ' برات کی خاطر تواضع کریں اور مہمانوں کی حیثیت سے ان کی ضیافت کریں ' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ ظاہر ہے کہ مہمانوں کی ضیافت ایک مسنون طریقہ ہے ۔ لیکن آج کل یہ رسم ضیافتِ مسنونہ کی بجائے شادی کی لازمی رسوم میں شامل ہو گئی ہے ۔ اور بے جا اور غیر ضروری پابندی ہے ۔

حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی انتہائی سادہ طریقے پر ہوئی تھی ۔ انس بن مالک ؓ کے ذریعے ابوبکر ؓ ' عمر ؓ ' عثمان ؓ ' طلحہ ؓ اور انصار کی ایک جماعت کو بلایا گیا ' رسول اللہ ؐ نے خود خطبہ مسنونہ پڑھ کر نکاح کر دیا ۔ نکاح کے بعد رسول اللہ ؐ نے حاضرین میں کھجوریں تقسیم کیں ' اور حضرت ام ایمن ؓ کے ہمراہ فاطمہ ؓ کو حضرت علی ؓ کے گھر بھیج دیا ۔ (تاریخ الخمیس)

۵۔ شادی کے موقع پر طوائفوں کا گانا بجانا ' ڈھول ' طبلہ ' بانسری ' سارنگی اور باجہ وغیرہ بجانا سب ممنوع ہیں ۔ رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ نے مجھے ان باجوں (مزامیر شیطانیہ) اور بت پرستی کو مٹانے کے لیے بھیجا ہے (مسند احمد) ۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ رنڈیوں (مغنیات) کی خرید و فروخت ' ان کو گانے بجانے کی تعلیم دینا اور اس کاروبار کی کمائی حلال نہیں ہے (مشکوٰۃ) ۔

مردوں کی محفل میں طوائفوں کا ناچنا اور گانا بجانا تو ظاہر ہے کہ آنکھوں اور کانوں کا زنا ہے اور حرام ہے ۔ لیکن عورتوں کی مخصوص محفل میں بھی ڈومنیوں اور میراثنوں کا ناچنا ممنوع ہے ۔ البتہ اگر عورتوں کی مخصوص محفل میں ' ڈھول باجے اور ناچنے کے بغیر ' کوئی بامقصد گانا گایا جائے اور ساتھ دف بجایا جائے ' یا دلہن کا استقبال کرنے کے لیے کوئی غیر مقدمی نظم پڑھی جائے ' تو اس کا ثبوت احادیث

میں موجود ہے (مسند احمد)۔ اسلام جائز اور بامقصد تفریح کی اجازت دیتا ہے ' اور خوشی کے موقع پر اپنے جذبات کا اظہار کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے۔

۶۔ جہیز دینا نہ لازم ہے اور نہ ممنوع ہے۔ لیکن آج کل اس کو بھی شادی کی ضروری شرائط میں شامل کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ناقابل برداشت پریشانیاں معاشرے میں پھیل گئی ہیں۔ ان اعظم النکاح برکۃ الیسرہ مئونۃ 'سب سے زیادہ برکت اس شادی میں ہوتی ہے جس میں بوجھ کم سے کم اٹھانا پڑے۔ (مسند احمد عن عائشہ ؓ)

البتہ لڑکی کا وارث اور سرپرست اگر اپنی خوشی سے اپنی استطاعت کے مطابق بچی کو اس کی ضرورت کی چیزیں دینا چاہے تو یہ ممنوع بھی نہیں ہے۔ بلکہ اپنی اولاد کے ساتھ احسان کرنا ہے جو مستحسن ہے۔ مگر یہ شادی کے لوازمات و شرائط میں شامل نہیں ہے۔

رسول اللہ ؐ نے اپنی بیٹی فاطمہ ؓ کو مختصر سا جہیز دیا تھا ' جو یہ تھا (۱) دو عدد یمنی چادریں (۲) دو عدد توشک (۳) ۴ عدد گدے (۴) دو عدد چاندی کے بازوبند (۵) ایک کمبل (۶) ایک گھڑا (۷) ایک تکیہ (۸) ایک پیالہ (۹) ایک چکی (۱۰) ایک مشکیزہ (۱۱) اور بعض روایتوں کے مطابق ایک پلنگ۔ (تاریخ خمیس)

اپنی حیثیت کے مطابق لڑکی کا وارث جو چاہے دے سکتا ہے 'لیکن آج کل جہیز کی نمایش اور فخر و مباہات کے لیے بڑا جہیز دینا ایک لازمی شرط بن گئی ہے۔ جس کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے تاکہ نکاح آسان سے آسان تر ہو جائے اور لڑکیاں جہیز فراہم ہونے کے انتظار میں بیٹھی نہ رہیں۔

۷۔ مہر عورت کا حق ہے۔ اس کی کم سے کم مقدار ۱۰ درہم ہے اور زیادہ سے زیادہ مقدار کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اگر قنطار یعنی بہت سا مال بھی اپنی خوشی سے مقرر کر لیا ہو تو اس کا ادا کرنا لازم ہے۔ (سورۃ النساء ۴: ۲۰) اپنی حیثیت کے مطابق جو چاہے اور جتنا چاہے مقرر کر سکتا ہے۔ لیکن فخر و مباہات کے لیے اور شرافت و کرامت کا ذریعہ سمجھ کر نمایش کے لیے زیادہ سے زیادہ مہر مقرر کرنا خلاف سنت ہے۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا ہے: خبردار عورتوں کا مہر نہ بڑھاؤ (یعنی حیثیت سے زیادہ نہ بڑھاؤ)۔ اگر یہ دنیا میں عزت و کرامت کی چیز ہوتی اور آخرت میں تقویٰ کی چیز ہوتی 'تو اللہ کے نبی ؐ اس کے زیادہ مستحق ہوتے حالانکہ رسول اللہ ؐ نے اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں میں سے کسی کا مہر بھی بارہ اوقیہ سے زیادہ مقرر نہیں کیا۔ دوسری روایت میں ساڑھے بارہ اوقیہ آیا ہے (یعنی کل ۵۰۰ درہم۔ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی بنتا ہے) (ابو داؤد)

حضرت فاطمہ ؓ کا مہر ۴ سو مثقال چاندی مقرر ہوا تھا (ایک مثقال ۴ ماشہ ۴ رتی چاندی ہوتا ہے)

حضرت ام حبیبہؓ (زوجہ رسولؐ) کا مہر اگرچہ ۴ سو دینار سونا (۴ ہزار درہم) مقرر ہوا تھا لیکن یہ شاہ حبشہ نجاشی نے اپنے ذمے لیا تھا۔ (سیرت ابن ہشام)

۸۔ مہندی اور مائیاں بٹھانے کی رسم تو ایک فضول رسم ہے' لیکن لڑکی کو دلہن بنانا اور شوہر کے گھر بھیجنے کے لیے تیار کرنا' اچھے کپڑے پہنانا' حسبِ توفیق زیور پہنانا' اور خوبصورتی کے لیے مہندی وغیرہ لگانا' اچھی چیزیں ہیں اور صحابیات سے ثابت بھی ہیں۔

۹۔ شادی کے موقع پر ادل بدل کے طور پر مروجہ طریقے پر تحفوں کا تبادلہ کرنا غیر ضروری رسم ہے جس کا انسداد ہونا چاہیے۔ البتہ دلہن کے لیے شوہر کے گھر آنے کے بعد پڑوسیوں یا رشتہ داروں کی طرف سے تحفے بھیجنا احادیث سے ثابت ہے۔

۱۰۔ ولیمہ مسنون ہے۔ اس کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ بلا تکلف اور بلا تفاخر سادہ طریقے پر جس قدر میسر ہو اپنے دوستوں کو کھلا دے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے: مقابلے اور نمائش کے لیے دیا ہوا ولیمہ بد ترین ولیمہ ہے۔ (گوہر رحمان)

شوہر جب بیوی کو خرچہ نہ دیتا ہو تو نکاح فسخ ہو سکتا ہے

لڑکی 'جس کا نکاح تقریباً ۶ سال پہلے زید سے ہوا تھا' ۴ سال پہلے اپنی والدہ کے ہمراہ کراچی آگئی تھی۔ اس ۴ سال میں اس کے شوہر نے کوئی خط نہیں بھیجا ہے۔ بہت سے خطوط زید کے نام بھیجے گئے لیکن تاحال کوئی جواب نہیں آیا۔ اب اس سے رابطہ کا کوئی ذریعہ نہیں ہے' نہ رابطے کی کوئی امید' اور یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ اب وہاں پر ہے یا نہیں۔ لڑکی کی والدہ کا کہنا ہے کہ ہم جب پاکستان آرہے تھے تو اسے ساتھ چلنے کو کہا' مگر اس نے کہا کہ تم لوگ جاتے ہو تو چلے جاؤ ہم یہیں رہیں گے۔ اب وہ نہ طلاق نامہ بھیجتا ہے اور نہ خرچہ بھیجتا ہے۔ والدہ چاہتی ہے کہ اپنی بیٹی کا کسی سے نکاح کرا لے کیا ان حالات میں لڑکی نکاح ثانی کر سکتی ہے؟

زید مفقود الخبر کی قانونی تعریف میں تو نہیں آتا۔ فقہا نے اس کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کی جائے رہائش بھی معلوم نہ ہو اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے یا قیام و سکونت کی جگہ معلوم ہو مگر موت و حیات کا پتہ نہ ہو۔ لڑکی کو یہ علم ہے کہ زید ڈھاکے میں رہتا ہے اور وہ دو سال پہلے اسے زندہ چھوڑ کر آئی تھی اس لیے ظاہر یہی ہے کہ وہ زندہ ہو گا اور ریڈ کراس کے ذریعے یا حکومت پاکستان کے سفارت خانے کے ذریعے یہ معلوم بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ اگرچہ اس میں کچھ زحمت اٹھانی پڑے گی۔

درمختار میں مفقود الخبر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: "مفقود لغت میں معدوم کو کہتے ہیں۔

شرعاً اس سے مراد وہ غائب شخص ہے جس کا حال معلوم نہ ہو کہ آیا زندہ ہے 'جس کے آنے کی امید نہ ہو یا مر کر سپرد لحد ہو گیا ہے"۔

ابن عابدین لکھتے ہیں: "میں کہتا ہوں کہ بظاہر مکان سکونت کا علم اس کی موت و حیات کے علم کو مستلزم ہے۔ اور اس کا عدم علم 'موت و حیات کے عدم علم کو مستلزم ہے۔ لیکن اگر اس کی جائے قیام تو دار الحرب میں معلوم ہو 'مگر اس کے حالات معلوم نہ ہوں کہ زندہ ہے یا مر گیا ہے 'تو بے شک یہ بھی مفقود الخبر ہے"۔

زوجہ "مفقود الخبر" کے بارے میں مالکیہ کا مسلک یہ ہے کہ چار سال کے بعد یا' بعض صورتوں میں ایک سال کے بعد 'اس کا نکاح فسخ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ مدت اس وقت سے شروع ہو گی جس وقت زوجہ مفقود کی درخواست پر قاضی مجاز نے فسخ نکاح کے لیے یہ مدت مقرر کی ہو۔ اس مدت کے بعد عدت گزار کر وہ نکاح ثانی کر سکے گی۔ علمائے دیوبند " نے مالکیہ کے مسلک پر فتویٰ دے دیا ہے۔ اس فتوے اور مالکیہ کے مسلک کی تفصیلات کے لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی " نے " الحیلة الناجزہ للحیلة العاجزہ " کے نام سے مستقل رسالہ لکھا ہے 'جس پر تقریباً تمام اکابر علمائے دیوبند کے تائیدی دستخط موجود ہیں۔

لیکن زید کے مفقود الخبر ہونے پر میں مطمئن نہیں ہوں اس لیے اس لڑکی پر مفقود الخبر کی زوجہ کے احکام کا اطلاق کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ البتہ فسخ نکاح کی ایک دوسری صورت بھی ہے۔

لڑکی اگر ڈھاکے سے اپنے شوہر کی اجازت اور رضامندی سے کراچی آئی تھی 'جیسا کہ سوال سے معلوم ہوتا ہے 'تو پھر اس کے اخراجات اور حقوق زوجیت شوہر پر واجب ہیں۔ اخراجات کی وصولی چونکہ بظاہر ناممکن ہے اس لیے مالکیہ اور حنابلہ کے مسلک کے مطابق وہ فسخ نکاح کی مستحق ہے۔

مالکیہ اور حنابلہ کے مسلک کے مطابق 'مسلمان جج 'جو شرعی احکام پر فیصلہ کرتا ہو 'یا بصورت دیگر دیانت دار اور عادل مسلمان علما کی ایک مجلس (پنچایت) 'عورت کی درخواست پر نکاح فسخ کر سکتی ہے اور وہ فسخ نکاح کے فیصلے کے بعد عدت گزار کر نکاح ثانی کر سکتی ہے۔ علمائے دیوبند " نے شدید ضرورت کے وقت اس مسلک پر فتویٰ دے دیا ہے 'اور بوقت ضرورت ایک فقہی مسلک سے دوسرے فقہی مسلک کی طرف رجوع کرنا ابن الہمام حنفی نے فتح القدیر میں اور علامہ شامی نے بھی جائز قرار دیا ہے۔

اس لیے لڑکی عدالت میں یا علما کی پنچایت میں 'جس کے ارکان کم از کم تین ہونے چاہییں 'حقوق زوجیت کی عدم ادائیگی کی بنا پر فسخ نکاح کی درخواست دائر کرے 'اور عدالت یا پنچایت ضروری تحقیق کے بعد فسخ نکاح کا فیصلہ دے دے۔ فیصلے کے بعد عدت گزر جائے تو جس سے چاہے نکاح کر سکتی ہے۔

اگر اس کا شوہر زید فیصلے سے پہلے یا فیصلے کے بعد عدت کے دوران آگیا تو بیوی اسی کی رہے گی۔ لیکن اگر عدت گزر جانے کے بعد آیا، تو فسخ نکاح اور عدت کے گزر جانے کی وجہ سے اس کا نکاح ٹوٹ گیا ہے، بیوی اسے نہیں ملے گی۔ وہ آزاد ہو گی جس سے چاہے نکاح کرے، نئے شوہر سے یا پرانے شوہر سے۔ (گ - د)

اعضا کی پیوند کاری

ترجمان القرآن، مارچ ۱۹۹۵ میں 'اعضا کی پیوند کاری کے مسئلہ پر' شائع ہونے والے ایک مقالے میں فاضل مصنف نے اپنے دلائل کے حق میں سلف کی حدیث و فقہ کی مستند کتابوں سے بے شمار حوالے دیے ہیں۔ ان میں سے دو حوالوں پر چار پانچ قارئین نے اپنے اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے بعض قارئین کی نظر میں مدیر کو ان حوالوں کو حذف کر دینا چاہیے تھا کیونکہ یہ سخت قابل اعتراض ہیں، ایسی چیزیں بطور حوالہ بھی ترجمان میں چھپنا ہی نہ چاہییں۔ ایک صاحب کی نظر میں ان حوالوں کو نقل کر کے مدیر نے اہانت انبیا کا ارتکاب کیا ہے، بعض نے اس معاملے کو اس طرح لیا ہے کہ گویا قرطبی جیسے جید علما کے حوالے دراصل ترجمان کی رائے یا مدیر کے فتویٰ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض کی نظر میں کسی اجتہادی مسئلے پر اختلافی آرا نقل کرنا ترجمان جیسے عوامی پرچے کی شان کے خلاف ہے، اور کنفیوژن پیدا کرتا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ مجموعی طور پر معاملے کی وضاحت کر دوں۔

۱- یہ ایک مذاکرہ تھا۔ ایک مقالہ پیوند کاری کے خلاف تھا، ایک حق میں۔ مقالے کا موضوع بہرحال استدلال کے لیے دیا ہوا کوئی حوالہ نہ تھا، پیوند کاری تھا۔ اپنے موقف کی تائید میں جو دلیل لائی جائے، اگر وہ مستند کتابوں سے نقل ہو، اس پر صاحب تحریر کو بھی ملزم نہیں گردانا جاسکتا، کجا کہ مدیر کو۔ اگر صرف حوالہ نقل کرنا گناہ اور قابل اعتراض ہو تو علمی بحث، اس کے لیے سلف کی کتابوں سے حوالے، ان کی اشاعت، سب کے دروازے بند ہو جائیں گے۔

۲- یہ مقالہ لکھنے والے ایک جید عالم ہیں، ایک بہت بڑی دینی درس گاہ کے صدر مدرس۔ یہ مقالہ جس مجلس میں پڑھا گیا وہاں ہر مکتب فکر کے علما کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہ جس کتاب میں شائع ہوا، وہ کثیر تعداد میں پھیل چکی ہے۔ جو اعتراضات آپ کے دل میں آئے، جو نتائج آپ نے نکالے، میرے علم کی حد تک وہ اعتراضات اور نتائج کہیں کسی نے بھی نہیں اٹھائے۔

۳- حوالے، جو فاضل مصنف نے بھی صرف نقل کرنے کے "جرم" کا ارتکاب کیا ہے، سلف کے جید علما کی مستند کتابوں میں سے ہیں۔ ایک حوالہ خلاصۃ الفتاویٰ سے ہے، اور دوسرا قرطبی کی

الجامع لاحکام القرآن سے۔ دونوں کتابوں کے مولفین کو بھی یہ گمان نہ گزرا کہ وہ یہ فتاویٰ نقل کرتے ہوئے کسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

۴۔ایک فتویٰ علامہ ابوبکر کا ہے' جسے خلاصۃ الفتاوی کے مولف نقل کرتے ہیں۔ دوسرے فتوے کی نسبت امام شافعی کی طرف ہے' جسے قرطبی نے نقل کیا ہے۔ ابوبکر اور امام شافعی جیسے بزرگوں کے علم و تقویٰ اور دینی حس کو بھی کوئی کھٹک محسوس نہ ہوئی کہ وہ ایسے فتوے دے کر کسی گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ اگر ان فتاویٰ کو نقل کرنا گناہ ہے' تو اصل گناہ گار ابوبکر اور شافعی ثابت ہوں گے جنھوں نے ایسے فتوے دینے کی جسارت کی' پھر کسی درجہ میں قرطبی۔

۵۔فاضل مصنف نے حوالے نقل کرتے ہوئے پوری احتیاط ملحوظ رکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی حرمت' انسانی اعضا کی حرمت سے زیادہ صراحت کے ساتھ ثابت ہے۔ یہاں تک کہ بے وضو اسے چھونا بھی جائز نہیں۔ لیکن علاج کے لیے فقہا نے آیات قرآنی بھی ناپاک چیزوں سے لکھنے کی اجازت دی ہے"۔ سوال یہ نہیں کہ فقہا نے یہ رائے دی ہے یا نہیں' وہ تو بہرحال دی ہے۔ یہ بھی نہیں کہ یہ رائے صحیح ہے یا نہیں۔ غلط ہو سکتی ہے۔ بلکہ استدلال یہ ہے کہ اگر فقہا علاج کے لیے قرآن مجید جیسی محترم کتاب کو اس طرح لکھنا جائز قرار دے سکتے ہیں' تو انسانی اعضا کی پیوند کاری علاج کے لیے کیوں ناجائز ہوگی۔

دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "ناقلین نے تو یہاں تک نقل کر دیا ہے کہ امام شافعی نے ..... الخ"۔ آپ الفاظ پر غور کیجیے' وہ اس کی نسبت امام شافعی کی طرف براہ راست نہیں کر رہے۔ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر رہے ہیں کہ "یہاں تک نقل کر دیا ہے"۔ پھر لکھتے ہیں کہ "اہل علم نے اس پر گرفت کی"' فقہا شوافع نے اس رائے سے رجوع کیا' اور یہ قرار دیا کہ "شارع کے نزدیک انبیا کی نعش کی حرمت مضطر کی روح سے بڑھی ہوئی ہے"۔

آپ کی نظر آگے اور پیچھے ان تمام احتیاطی اور استثنائی کلمات پر سے تو اچٹ گئی' جن کی وجہ سے ایڈٹ کرتے ہوئے مجھے کسی حذف کی ضرورت محسوس نہ ہوئی' لیکن صرف اس پر اٹک گئی کہ ترجمان القرآن میں "یہ جملے" چھپے ہیں' اور یہ ایک گناہ کا ارتکاب ہوا ہے۔

۶۔میں نے پورا مقالہ پڑھا تھا' اور کیونکہ میں نے ہر بات کو سیاق و سباق میں پڑھا تھا اس لیے مجھے یہ بالکل نہ کھٹکی۔ اگر یہ بات مجھے کھٹکتی تو یہ بالکل اسی طرح کی بات ہوتی کہ میں اس بات پر کھٹکتا کہ قرآن میں "لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ" لکھا ہے' قرآن میں مضطر کو سؤر کا گوشت کھانے کی اجازت دی گئی ہے مجبور آدمی کو کلمۂ کفر کہنے کی اجازت دی گئی ہے۔ میں ان باتوں کو حذف کر سکتا تھا' لیکن یہ ایسا ہوتا جیسے

چہ کہ میں قرآن سے لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ یا فَمَنِ اضْطُرَّ کے الفاظ حذف کر دیتا۔

۷۔ پھر اگر ہم اسی طرح حذف کرنے پر آئیں 'تو ہمیں تفسیر 'حدیث اور فقہ کے قیمتی ذخیروں سے بے شمار باتیں حذف کرنا ہوں گی' یا پھر ان کے حوالے دینے سے احتراز کرنا ہو گا۔ کیا ہم اس بات کے لیے تیار ہیں؟

۸۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس سے ترجمان کی دعوتی حیثیت مجروح ہوتی ہے 'تو حقیقت یہ ہے کہ ترجمان ہمیشہ سے علمی بھی رہا ہے اور دعوتی بھی۔ علمی ہونا اور دعوتی ہونا باہم متناقض امور بھی نہیں ہیں۔ دعوت کے وسیع مفہوم میں یہ شامل ہے کہ عہدِ حاضر کے مسائل پر بحث 'مذاکرہ اور ان کے حل کی تلاش کی جائے۔

۹۔ اب دوستوں کی عادت ہو گئی ہے کہ وہ چھوٹتے ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ مولانا مودودی" کے زمانے میں ترجمان میں ایسی اختلافی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ یہاں تو یہ باتیں بطریق استدلال اور حوالوں سے نقل ہوئی ہیں 'اور مدیر کا مقام تو نہ مفتی کا ہے نہ مجتہد کا' (صاحب مقالہ کا ضرور ہے) مولانا مودودی "تو خود مجتہد اور مفتی تھے 'مفکر بھی تھے۔ انھوں نے ترجمان میں جو اپنی آرا اور فتاویٰ شائع کیے ہیں' ان میں سے بعض کی بنیاد پر بڑا اختلاف پیدا ہوا' اور ان کے خلاف بہت سے فتوے جاری ہوئے۔

۱۰۔ بہرحال آیندہ میں آپ جیسے قارئین کی سوچ اور فکر کو بھی سامنے رکھا کروں گا۔ لیکن جہاں دور دورہ میں کوئی اپنی رائے دے رہا ہوں نہ فتویٰ' میں اس کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ آیندہ سلف میں سے کبھی کسی کی ایسی رائے نقل نہ ہو گی جو آپ کو ناگوار ہو۔

ترجمان 'اسلام اور امت کے مستقبل کا نقیب بھی ہے' آج کے سلگتے ہوئے سوالات کا جواب دینے یا کم سے کم تیار کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ سلف کے درمیان بھی جب اختلافات ہوئے 'تو نئے مسائل پر آج بھی اختلاف ہوں گے' لیکن بحث و تمحیص کے علاوہ ان کا حل نکلنا ممکن نہیں۔ قارئین کو جس عالم پر اعتماد ہو اس کی پیروی کریں' لیکن ترجمان کے صفحات کو آج کے سلگتے ہوئے مسائل پر بحث و مذاکرہ سے پاک رکھنے پر اصرار نہ کریں۔ (خرم مراد)

کتاب نما

رودادِ قفس، جلد دوم: سید علی گیلانی- ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز ایف ۷/۱، مرکز اسلام آباد- صفحات: ۲۱۲- قیمت: ۱۲۰ روپے۔

اس کتاب کا پہلا حصہ ایک برس پہلے شائع ہوا تھا- (اس پر تبصرہ، فروری ۱۹۹۴) زیر نظر حصہ، اسی تسلسل میں جزو ۴۴ سے ۷۰ پر مشتمل ہے- آپ بیتی کا یہ حصہ سنٹرل نیو جیل الٰہ آباد اور "روز فارم" مانڈی کے زمانہ اسارت کی روداد پر محیط ہے۔

سید علی گیلانی کی یہ آپ بیتی روایتی قسم کی داستان حیات نہیں، بلکہ پسِ دیوارِ زنداں گزرے ہوئے ماہ و سال کا ایسا تذکرہ ہے، جو اپنے اندر لکھنے والے کے محسوسات، واردات اور ذہنی ردِ عمل کے علاوہ اس کے رفقائے زنداں کے شب و روز، اہلِ وطن کی حالتِ زار، بھارت کی نام نہاد سیکولر جمہوریت، جدوجہد آزادی اور جہاد کشمیر کی پوری ایک داستان لیے ہوئے ہے- دلچسپ، دل گداز، معلومات افزا اور عبرت انگیز و سبق آموز۔

جیل میں اسیروں کی حالت کیا تھی؟ علی گیلانی بتاتے ہیں: "گرمیوں کی شدت، کال کوٹھڑیوں کی تنگی، پنکھوں سے محرومی، لیمپ اور ٹیوب کی اضافی گرمی، کھدر کے کھردرے کپڑے، پانی کی راشن بندی، ناقص اور ناموافق غذا، دودھ دہی کی شکل تک دیکھنے سے محرومی، ان سب اسباب نے ہماری زندگی بڑی تلخ بنا دی تھی اور ہم لوگ جسمانی اعتبار سے روز بروز نڈھال ہوتے جا رہے تھے" (ص ۷۷)- لیکن زندانی کمال صبر و استقامت سے ہر طرح کے مصائب و شدائد اور سختیاں برداشت کرتے رہے کہ وہ قلبِ سلیم اور ایمانِ مستقیم کی دولت سے مالا مال تھے۔

سید علی گیلانی نے "دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت" ہونے کی دعویدار حکومت کے اوچھے ہتھکنڈوں کا بھی ذکر کیا ہے- سنگ دلی، بے انصافی، آئین و قانون کی پامالی، سیاسی انتقام اور سامراجی طور طریقے، وہ کہتے ہیں کہ گذشتہ ۴۴ برسوں میں بھارت میں اقلیتوں پر دل دہلا دینے والے ظلم ہوئے ہیں، جن کے رستے ہوئے زخموں نے بھارت کے سیکولرازم اور جمہوریت کے چہرے کو داغ دار اور

گھناؤنا بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب گنگا اور جمنا کا پانی بھی اسے صاف نہیں کر سکتا (ص ۲۵)۔ اور جنس انسانی کے ساتھ جو زیادتیاں بھارت میں رکھی جاتی ہیں وہ شاید دنیا میں اور کہیں نہ پائی جاتی ہوں (ص ۲۲)۔ علی گیلانی کو تشویش ہے کہ "بھارت کا سماج اخلاقی اور انسانی قدروں کے لحاظ سے بڑی تیزی سے روبہ زوال ہے"۔

"روداد قفس" کا یہ حصہ بھی' پہلے حصے کی طرح سادہ و صاف نثر میں لکھا گیا ہے۔ علی گیلانی کا اسلوب ان کے شعری و ادبی ذوق کا آئینہ دار اور وسیع تر مطالعے کا شاہد ہے۔

اس کا مقصدِ تالیف بقول مولف: مطالعے یا لکھنے کی "خوش گوار مشق" نہیں بلکہ "اہل کشمیر کے دکھی دلوں کی تڑپ اور رستے ہوئے ناسوروں کی جلن بانٹنا" ہے۔ یہ کتاب اردو کے زندانی ادب میں ایک قابل توجہ 'بلکہ ناقابل فراموش اضافہ ہے۔ (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

زندگانی کی گزرگاہوں میں: ملک نصراللہ خان عزیز (مرتب: اختر حجازی)۔ ناشر: تسنیم پبلی کیشنز چوک اردو بازار لاہور۔ صفحات: ۲۰۵۔ قیمت: ۵۰ اروپے۔

ملک نصراللہ خان عزیز (۱۸۹۷ - ۱۹۷۶) اپنے عہد کے ممتاز صحافی تھے۔ ان کا شمار ابوالکلام آزاد' ظفر علی خان' چراغ حسن حسرت' غلام رسول مہر' عبدالمجید سالک اور مرتضیٰ احمد خاں میکش جیسے اکابرِ صحافت کی صف میں ہوتا چلا ہے۔ ایک بااصول انسان اور صاحبِ عزیمت و کردار صحافی کی حیثیت سے ان کا نام برعظیم کی صحافتی اور ادبی تاریخ میں ہمیشہ ممتاز رہے گا۔ ایک زمانے میں وہ راجا صاحب محمود آباد کے اخبار ہمدم کے ایڈیٹر مقرر ہوئے' مگر ان کی تحریریں راجا صاحب کو خوش نہ آئیں۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ میں اپنے اخبار میں اپنے مسلک کے سوا کسی شے کا چھپنا پسند نہیں کرتا۔ ملک صاحب کا جواب تھا: "بلاشبہ اخبار آپ کا ہے مگر قلم میرا ہے اور میں اس سے وہی کچھ لکھوں گا جس کو صحیح سمجھتا ہوں"۔ راجا صاحب کے لیے یہ چیز ناقابل برداشت تھی۔ انھوں نے اس روز کے اخبار کی پوری اشاعت نذرِ آتش کر دی۔ ملک صاحب یہ کہہ کر ادارت سے الگ ہو گئے کہ میں قلم کو روپے کے عوض فروخت نہیں کروں گا۔

ایک زمانے میں ملک صاحب' مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت "الہلال" کے مداح رہے' بعد ازاں جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ دنیاوی حیثیت میں بھی انھوں نے ایک کامیاب و بامراد زندگی گزاری۔ اس کا راز کیا تھا؟ زیر نظر یادداشتوں میں ایک نکتہ توجہ طلب ہے۔ کہتے ہیں: مجھے والدین کی طرف سے پابندی نماز کی خاص ہدایت تھی' اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی توفیق بخشی' اور اگر آج

میں یہ کہوں کہ نماز کی پابندی نے میری پوری زندگی کا نقشہ مرتب کیا تو غلط نہیں ہو گا۔ میں نے یہ دیکھا کہ نماز قفلِ زندگی کی کلید ہے۔ میں نے نماز باجماعت پر کسی بڑے سے بڑے اور ضروری سے ضروری کام کو بھی ترجیح نہیں دی۔ اس سے مجھے ناقابل بیان روحانی' قلبی' ذہنی اور جسمانی فیض حاصل ہوا' اور میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جو کام نماز کو پس پشت ڈال کر کیا جائے اس میں برکت ہرگز نہیں پڑ سکتی' لیکن اگر نماز کی وجہ سے کسی کام کو موخر کر دیا جائے تو ان شاء اللہ اس کام میں خرابی واقع نہیں ہوگی (ص ۱۵۱-۲۲۵)

ملک صاحب نے ایک زمانے میں اپنی یادداشتیں لکھنا شروع کی تھیں (ایشیا- اردو ڈائجسٹ)' زیر نظر کتاب میں انھی یادداشتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ ان میں لکھنے والے کے ذاتی احوال و کوائف' تجربات و مشاہدات اور تاثرات بھی ہیں' اور اپنے دَور کی تاریخ' سیاست' صحافت' مذہبی اور سماجی تحریکوں' شخصیتوں اور رجحانات کا تذکرہ بھی۔ مولانا آزاد' منشی محمد صدیق' مولانا مودودی' ظفر علی خان' مولانا احمد علی' عبدالمجید سالک' اسی طرح ہندو ذہن' کانگریس کی سیاست' قادیانی تحریک' مجلس احرار' مولانا آزاد کی "حزب اللہ"' جماعت اسلامی کی تحریک اقامت دین' اور دیگر بہت سی شخصیات اور سیاسی و معاشرتی رجحانات کی دلچسپ تفصیل اور واقعات۔

ملک صاحب ایک منجھے ہوئے ادیب اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ ان کا اسلوب سہل اور رواں دواں ہے۔ یہ کتاب اردو کے خود نوشت ذخیرۂ ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔ اگرچہ مرتب نے یادداشتوں کی اقساط' تلاش کرنے میں محنت کی ہے' مگر ان کی خاطر خواہ تدوین نہیں ہو سکی۔ بعض مقامات پر ضروری وضاحتوں اور حواشی کا اہتمام کر لیا جاتا تو کتاب کی افادیت دوچند ہو جاتی۔ املا اور پروف کی درستی کی طرف بھی توجہ نہیں دی جا سکی۔ (ر-ہ)

مولانا ابو الکلام آزاد' ایک نادر روزگار شخصیت : مولانا غلام رسول مہر (مرتب: محمد عالم مختار حق)۔ ناشر: مہر سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ ۱۲- اسلام سٹریٹ مسلم ٹاؤن لاہور۔ صفحات: ۲۸۸۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

مولانا ابو الکلام آزاد برعظیم کی ایک نابغہ شخصیت تھی۔ اگرچہ تحریک آزادی میں کانگریس کی ہم نوائی کی وجہ سے بعض مسلم حلقوں میں ان کی شہرت متاثر ہوئی لیکن الہلال اور البلاغ کے مدیر' ایک صاحب طرز ادیب' حریت پسند راہ نما اور ممتاز عالم دین کی حیثیت سے انھیں علمی حلقوں میں ہمیشہ پذیرائی حاصل رہی ہے۔ پاکستان میں ان کے حوالے سے جو علمی کام ہوا ہے' اس میں مولانا غلام

رسول مہر کی کاوشیں اور نگارشات خاص طور پر جاذب توجہ ہیں - زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں آزاد کے ایک مداح محمد عالم مختار حق نے ان کے مضامین کو یکجا کر دیا ہے -

مہر صاحب ، مولانا آزاد سے ۱۹۱۲ میں متعارف ہوئے اور پھر ان کی تحریکوں "حزب اللہ" اور "ولنظم جماعت" کے رکن بنے - آزاد سے ان کی عقیدت و محبت کا رشتہ تقریباً نصف صدی کی مدت پر محیط ہے - اگرچہ ملکی و سیاسی معاملات میں انھوں نے آزاد کی رائے سے شدید اختلاف بھی کیا لیکن وہ ان کی دینی عظمت ، شخصی فضائل اور قومی خدمات کے ہمیشہ معترف رہے - انھوں نے مولانا آزاد سے دلی وابستگی کا بے مثال ثبوت دیا اور ان کی تصانیف کی ترتیب و تدوین ، سیرت و سوانح کی تالیف اور افکار کی تشریح و ترجمانی کے سلسلے میں گراں قدر خدمات انجام دیں - ان میں "نقش آزاد" "تبرکات آزاد" "باقیات ترجمان القرآن" "رسول رحمت" اور "انبیائے کرام" نسبتاً اہم ہیں - انھوں نے India Wins Freedom کا اردو ترجمہ بھی کیا جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے - وہ مولانا آزاد کی سوانح عمری بھی لکھنا چاہتے تھے مگر یہ مکمل نہ ہو سکی - انھوں نے مولانا آزاد پر اپنے مضامین کا انتخاب کر لیا تھا لیکن موت نے ترتیب و تدوین کی مہلت نہ دی - محمد عالم مختار حق نے ان کی سولہ نگارشات کو نہایت خوبی اور عمدہ طریقے سے مرتب کر کے آزاد صدی کی مطبوعات میں مفید اضافہ کرنے کا اعزاز حاصل کیا ہے - انھوں نے تمام مضامین کے ماخذ کی نشان دہی کر دی ہے اور حسب موقع حواشی و تعلیقات بھی دے دیے ہیں -

آغاز میں تقریباً پچاس صفحے پر مشتمل مبسوط مقدمے میں ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے مولانا مہر کی آزاد شناسی کا بھرپور جائزہ لیا ہے - اس کتاب میں شامل جملہ مضامین زور استدلال کے ساتھ ساتھ مولانا مہر کے مخصوص طرز نگارش کے حامل ہیں اور اس بنا پر جاذب توجہ ہیں - اس سے پیشتر علامہ اقبال پر مولانا مہر کے مضامین "اقبالیات" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں - امید ہے کہ زیر نظر مجموعہ بھی علمی حلقوں میں قبول عام حاصل کرے گا - (ڈاکٹر رحیم بخش شاہین)

اس گھر کو آگ لگ گئی : سلیم قریشی ، عاشور کاظمی - ناشر : انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی - صفحات : ۲۴۲ - قیمت : ۱۲۰ روپے -

۱۳۸ سال پہلے ، اسی ماہ مئی میں ہندستان پر قابض انگریز حکمرانوں کی تیار کردہ فوج کی بعض مقامی رجمنٹوں نے میرٹھ ، بریلی اور لکھنؤ وغیرہ میں "بغاوت" کرتے ہوئے ، انگریزی عمل داری کے خلاف مزاحمت کا آغاز کیا - "غدر" کا یہ سلسلہ پورے ملک میں پھیل گیا اور کئی ماہ تک جاری رہا ، مگر

بالآخر انگریزوں سے گلوخلاصی کی یہ کوششیں ناکامی پر منتج ہوئیں۔ دیگر عوامل کے ساتھ اس کی ایک بنیادی وجہ انگریزوں کے زرخرید بہت سے ہندستانی جاسوسوں کی مخبری تھی، جو وہ انگریزی فوج کے افسروں کے نام بذریعہ خطوط کیا کرتے تھے--- زیرنظر کتاب انھی "غداروں کے خطوط" پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ریکارڈ سے حاصل کیے گئے ہیں۔

انگریز، ہندستانیوں کی اس کمزوری سے واقف تھے کہ معمولی سی دولت، جاگیر، عہدے یا خطاب کے لالچ سے ان کا ضمیر اور قلب و ذہن خریدا جاسکتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ بعض غداروں اور ضمیر فروشوں نے براہِ راست انگریزوں کی عسکری مدد کی۔ زیرنظر خطوط سے پتا چلتا ہے کہ مجاہدین کی مشاورت میں شامل بعض غدار، انگریزوں کو تمام منصوبوں سے باخبر کیا کرتے تھے۔ بہت سے رجب علی، گوری شنکر، کلو اور موہن مفصل علاقوں میں، مجاہدین کی فوجوں کی نقل و حرکت اور تعداد، اسلحے کی کیفیت، توپوں کی تعداد، جھڑپوں کی تفصیل، مجاہدین کے معاونین، آبادیوں کی کیفیت اور مختلف وقوعات سے انگریزوں کو روز بہ روز اور لحظہ بہ لحظہ باخبر رکھتے تھے۔ ان میں سے بادشاہ کی مشاورتی کونسل کے رکن اور بارودخانے کے داروغہ رجب علی نے شاہی بارودخانہ اور مرزا الٰہی بخش نے جمنا پر کشتیوں کا پل تباہ کر کے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کیے۔

مرتبین نے اس کتاب کے لوازمے کی تلاش اور ترتیب و تدوین میں بڑی محنت کی ہے۔ ابتدا میں عاشور کاظمی نے اپنے سیرحاصل مقدمے (ص ۱۹ تا ۱۷) میں متعلقہ دستاویزات و مخطوطات اور رپورٹوں کی مدد سے ۱۸۵۷ کی ناکام جدوجہد کا پورا پس منظر واضح کیا ہے، اور آخر میں یہ اہم سوال کیا ہے کہ "کیا محترم تاریخ دان دانش ور اس موضوع پر تحقیق کریں گے کہ برصغیر میں آج بھی اہل منصب وہی لوگ تو نہیں، جن کا سلسلہ وہاں سے ملتا ہو، جہاں سرفروش جانبازوں کے سروں کے معاوضے سے اونچے محل تعمیر کیے گئے---"۔ بعض اخباروں، کتابوں، رپورٹوں اور دستی تحریروں کے عکس بھی شامل کتاب ہیں۔

اس کتاب سے انگریزوں کی سازشوں اور سفاکیوں کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بعض اوقات آستین کے سانپ اور گھر کے بھیدی ہی اداروں اور تحریکوں کی ناکامی کا بنیادی سبب بنتے ہیں۔ دشمنوں کے آلۂ کار بن جانے والے مفاد پرست ہر زمانے اور ہر دَور میں موجود رہے ہیں، لہٰذا اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کرنے والوں کو داخلی محاذ کی حفاظت سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ (ر - ہ)

پاکستان کا نظام تعلیم، ماضی و حال کے آئینے میں: حکیم مشاریق احمد خاں۔ ناشر: باب الشفا،

ایل ۸۸۵ سیکٹر ۵ ایل 'نارتھ ناظم آباد' کراچی- صفحات: ۱۲۴- قیمت: ۷۵ روپے-

حکیم صاحب نے بڑے خلوص اور مہارت سے پاکستان کے تعلیمی بگاڑ کے اسباب کا سراغ لگایا ہے- (دو سو سالہ غلامی کے اثرات' دہرا نظام تعلیم' انگریزی کی بالادستی' اساتذہ اور طلبہ کی نظریاتی اور اخلاقی تربیت سے بے نیازی' قومی بے حسی' تحقیق و تصنیف سے غفلت' حکومت کی ترجیحات میں تعلیم کا پست مقام اور تعلیمی عمل میں جذبہ جہاد کا عدم اہتمام)- بقول مصنف: "ہمارے ملک میں بیشتر اہم خرابیوں کے ذمہ دار ہمارے ملک کے ناخواندہ افراد نہیں ہیں- رشوت ستانی' اقربا پروری' بدعنوانی' دہشت گردی اور لسانی اور گروہی تعصبات جیسی برائیاں' جو ہمارے ملک کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں' یہ سب ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی پیداوار ہیں"- (ص ۹)

مصنف کے اخذ کردہ نتائج کی بنیاد' بعض عبرتناک حقائق ہیں' مثلاً: یہ کہ کالج اور یونی ورسٹی کی سطح پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کا تناسب پاکستان میں صرف ۲ فیصد ہے' جبکہ بھارت میں ۹ فیصد' فلپائن میں ۲۶ فیصد اردن میں ۳۲ فیصد اور امریکہ میں ۵۶ فیصد ہے-

مصنف نے پاکستان کے کئی سو سالہ تعلیمی پس منظر کا مختصر مگر جامع جائزہ لیا ہے- اسی طرح "نظریہ پاکستان اور تعلیمی تقاضے"' "پاکستان کا تعلیمی منظر" اور اصلاح احوال کے لیے آخری باب' موضوع پر مصنف کی عالمانہ دسترس اور معاملہ فہمی ظاہر کرتے ہیں- مصنف کے سادہ' دو ٹوک اور ایک حد تک ادبی اسلوب کی بنا پر واضح ابلاغ اس کتاب کی نمایاں خوبی ہے- قیمت زیادہ محسوس ہوتی ہے- (ر- د)

ذوق تماشا' پروفیسر شیخ محمد اقبال- ناشر: پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ سرگودھا- صفحات: ۱۵۲- قیمت: ۴۰ روپے-

اس کتاب کا موضوع پاکستان میں نابیناؤں کے مسائل اور ان کا حل ہے- مصنف ان مسائل کا ذاتی تجربہ رکھتے ہیں کیوں کہ وہ دس سال کی عمر میں نابینا ہو گئے اور اس طرح ان مسائل سے نبرد آزما رہے ہیں- اس کشمکش میں کبھی تو انھیں کامیابی ہوئی اور کبھی وہ شکست سے دوچار ہوئے مگر انھوں نے اپنے بقول "کبھی مکمل شکست قبول نہیں کی"- المیہ تو یہ ہے کہ ہم اپنے معذور بھائیوں سے تمام تر ہمدردی کے باوجود ان کے حقیقی (خصوصاً نفسیاتی) مسائل سے ناواقفیت اور بعض غیر معقول رسموں کی بے جا پیروی کرتے ہوئے ان کی مشکلات میں مزید اضافے کا سبب بنتے ہیں- معاشرتی سطح پر ان نادانیوں اور ستم ظریفیوں سے بچنے کے لیے حقائق کا ادراک اور نابیناؤں کے احساسات سے آگاہی بہت ضروری ہے اور یہی اس کتاب کا موضوع ہے- فی الحال تو صورت یہ ہے کہ معذوروں کے مسائل کے

حل کے لیے ہم اس حد تک کوشش نہیں کر رہے جتنی مغرب کے سیکولر اور مفاد پرست معاشرے میں کی جارہی ہے۔

ہمارے بیمار معاشرتی رویوں پر تنقید اور ان کی اصلاح کے لیے بعض تجاویز کے علاوہ' یہ کتاب حکومتی سطح پر کیے جانے والے ان اقدامات کا بھی جائزہ لیتی ہے جو نابیناؤں کے مسائل کے حل کے لیے کیے گئے' جیسے جنرل ضیاء الحق کے دور میں سرکاری ملازمتوں میں معذوروں کے لیے ایک فیصد کوٹا مخصوص ہوا۔ اس کے باوجود نابیناؤں کے مسائل کے حل کی طرف قابل ذکر پیش رفت نہ ہونے کے متعدد اسباب ہیں۔ مصنف کے خیال میں ناکامی کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ ان منصوبوں کی تشکیل اور ان پر عمل در آمد کے سلسلے میں خود معذوروں کی آرا کو کماحقہ' مد نظر نہیں رکھا گیا۔ خصوصاً ان باہمت نابیناؤں کے خیالات سے بھی استفادہ نہ کرنا افسوسناک ہے جنھوں نے تمام تر مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے مفید اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شہری بن کر دکھایا۔ ان قابل قدر اشخاص میں خود کتاب ہذا کے مصنف شامل ہیں جو ایم اے' ایم فل ہیں اور گورنمنٹ کالج سرگودھا کے شعبہ انگریزی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ مصر کے معروف دانش ور' ادیب اور سابق وزیر تعلیم ڈاکٹر طٰہٰ حسین بھی نابینا تھے۔

(ڈاکٹر بلال مسعود)

امریکہ میں مسلمان اور ان کی قیادت ابراہیم ہمدانی۔ ناشر: اسلامک پبلی کیشنز' لاہور۔ صفحات: ۱۵۲۔ قیمت: درج نہیں۔

ابراہیم ہمدانی ۱۹۷۵ء سے سیکرامنٹو (کیلی فورنیا' امریکہ) میں امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ قبل ازیں وہ پاکستان میں شعبہ تدریس سے وابستہ رہے۔ قیام امریکہ کے دوران میں انھیں بہت سے تلخ و شیریں تجربات کا سامنا کرنا پڑا' جو اس کتاب کی تحریر کا محرک ہوئے۔

ابتدا میں اسلام کے تصور امامت و قیادت کا علمی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس موضوع پر' حوالہ جات کے صحیح اہتمام کے ساتھ ایسا مختصر مگر جامع جائزہ کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ پھر اس حوالے سے بتایا گیا ہے کہ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ اور اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ کے زیر انتظام تمام مساجد میں صدر' امیر اور امام ایک ہی فرد ہوتا ہے' لیکن بعض دیگر مساجد میں مسجد کمیٹی جیسی خود مختار اور حکومتی دباؤ سے آزاد تنظیموں کی صدارت بھی عموماً کسی ایسے شخص کے سپرد کر دی جاتی ہے جو اس منصب کے لیے بالکل ناموزوں ہوتا ہے' اور بعض اوقات مساجد' محافل موسیقی تک کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہیں (ص ۸۰)۔

مصنف نے امریکی مسلمانوں کی تاریخ اور مسلم تنظیموں کے بارے میں مفید اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔اس سے پتا چلتا ہے کہ امریکہ میں مسلم آبادی بڑھ رہی ہے (اور یہودیوں کی آبادی میں کمی واقع ہو رہی ہے) ماضی میں 'چند ایک مساجد کے چرچ میں تبدیل ہونے کے سانحے بھی رونما ہوئے لیکن اب سیاہ فام مسلمانوں کی صحیح اسلام کی طرف مراجعت سے صورت حال بہتر ہو رہی ہے۔اس کے باوجود مصنف نے بڑے دکھ کے ساتھ بتایا ہے کہ امریکہ میں بے شمار مسلمانوں کی اولاد خدا سے بے نیاز بدترین مادہ پرست تہذیب کی نذر ہو چکی ہے اور لگاتار ہو رہی ہے۔"کتنے محمد اور خان جیسے خوب صورت اسلامی ناموں والے افراد امریکی معاشرے میں گم ہو کر غیر مسلم بن گئے؟ مسلمانوں کی کتنی بیٹیاں اسلام سے بغاوت کر چکی ہیں؟" (ص ۔ ۷)۔اس صورت حال کا علاج 'بقول مصنف اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے ڈالر کمانے کے چکر سے باہر نکل کر---خود دین اسلام کو سمجھیں اور اس پر دل و جان سے عمل کریں۔بچوں کے لیے قرآن اور اسلام کی تعلیم کا اہتمام کریں"۔ان کے خیال میں مسجد کا ادارہ اصلاح احوال کے لیے بنیادی اور فیصلہ کن رول ادا کر سکتا ہے۔

کتاب کے آخری تہائی حصے میں سیکر امنٹو کی مسجد کی امامت کے دوران میں 'مصنف کو پیش آمدہ کچھ تلخ تجربات کا قدرے طویل تذکرہ ہے جو دلچسپ ہے اور سبق آموز بھی---مجموعی طور پر مصنف کے ہاں حمیت اسلامی 'امریکی مسلمانوں کے بارے میں فکرمندی اور اسلام کے لیے دردمندی کے جذبات نمایاں ہیں۔معیار اشاعت و طباعت بہت اطمینان بخش ہے۔قیمت کا درج نہ ہونا افسوس ناک کوتاہی ہے۔ (ر-ہ)

نیکی کی کلیاں (۶ حصوں میں بچوں کے لیے کہانیاں) : ڈاکٹر انعام الحق کوثر۔سیرت اکیڈمی ۲/۷۲ اے ' او بلاک ۳ ' سیٹلائٹ ٹاؤن 'کوئٹہ۔صفحات: کم و بیش ۔ قیمت ۔ درج نہیں۔یونی سیف کے تعاون سے تیار و شائع کردہ مختصر 'تعمیری اور اخلاقی کہانیاں 'نئی ترجمے واقعات پر مبنی ہیں۔اسلوب دلچسپ اور زبان سادہ۔ایک مفید اور کامیاب کاوش۔

عدل کی تلاش : ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی۔مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔صفحات: ۵۵۔قیمت ۸ روپے۔بھارت کے مجلے "زندگی نو" میں شائع شدہ اداریوں کا مجموعہ۔عدل و انصاف کی تلاش اور جستجو کی جدوجہد کا مختصر جائزہ۔مصنف کے بقول 'عدل کا "حصول خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر ممکن نہیں ہے"۔

مدیر کے نام

افتخار احمد ملک' پڑیال ضلع راولپنڈی

ترجمان القرآن (اپریل ۹۵ء ص ۲۲) پر حضرت حسان ؓ کے اشعار شائع ہوئے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں ہیں۔ درست ترتیب اور اصل اشعار یوں ہیں:

و احسن منک لم تر قط عینی	و اجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرا من کل عیب	کانک قد خلقت کما تشاء

ان اشعار کا درست ترجمہ یوں ہے:

آپ ؐ سے زیادہ خوبصورت میری آنکھ نے نہیں دیکھا اور آپ ؐ سے زیادہ حسین کسی عورت نے جنم نہیں دیا۔

آپ ؐ تو ہر نقص سے پاک پیدا کیے گئے ہیں گویا کہ آپ ؐ جس طرح چاہتے تھے آپ ؐ کی تخلیق کی گئی۔

مضمون نگار نے پہلا شعر بعد میں درج کیا اور اس میں دونوں مصرعوں میں الفاظ آگے پیچھے کر دیے جس سے شعر کا وزن کچھ سے کچھ ہو گیا۔

عنایت علی خان' حیدر آباد

زیارت نبوی ؐ (اپریل ۹۵) ترجمان القرآن جیسے معتبر علمی رسالے سے زیادہ کسی ادبی رسالے کے مزاج کا ہے۔ نفس مضمون سے متعلق تو ایک حدیث بھی پورے مضمون میں نظر نہیں آئی۔ اشعار کی بھرمار ہے جس میں یہ شعر بھی شامل ہے جس میں کعبے کا استخفاف ہوتا ہے

اندر دو جہاں کعبہ ماکوئے محمد ؐ	محراب دل و جاں خم ابروئے محمد ؐ

مشہور حدیث کی رُو سے سفر مسجد نبوی ؐ کی زیارت کے لیے تو کیا جا سکتا ہے' شہر اور کوچوں کی زیارت کے لیے نہیں۔ اس قسم کی باتوں سے عقیدہ رسالت تفریط کا شکار ہوتا ہے۔ پوری اردو اور فارسی شاعری دیکھ ڈالیے۔ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ کی زیارت کی خواہش اور آرزو پر مبنی گنتی کی تخلیقات ملیں گی۔ حمدیہ مجموعہ بھی میرے علم کی حد تک اردو میں صرف ایک ہے جبکہ آرزوے دید مدینہ پر دفتر کے دفتر موجود ہیں اور شاید ہی کوئی مسلمان شاعر ہو جس نے نعت نہ کہی ہو۔ نعت گوئی بڑی سعادت ہے لیکن بعد از خدا کا التزام ضروری ہے۔ حفظ

مراتب کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے نہیں۔

محمد الیاس انصاری، لاہور

اشارات (اپریل ۹۵) بہت خوب اور برمحل تھے۔ اگر انگریزی میں ترجمہ کر کے کتابچے کی شکل دے دی جائے تو دنیائے مغرب کی انسانی حقوق کی تنظیموں کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کرنے کی ایک ٹھوس کوشش کی جا سکتی ہے۔

"چین کا بدلتا معاشرہ" (مسلم سجاد) میں مسلمانوں کے بارے میں تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ چین میں مسلمانوں سے متعلق اعداد و شمار ہمیشہ سے ہی متنازعہ چلے آرہے ہیں اور اس کی وجہ مردم شماری کا غیر مذہبی بنیادوں پر منعقد کرایا جانا ہے۔ چین کی ۵۶ قومیتوں میں سے ۱۲ قومیتوں میں مسلمان باشندے اکثریت یا اقلیت میں پائے جاتے ہیں۔

مسلم اقلیتوں پر کام کرنے والی معروف علمی شخصیت جناب علی کتانی کے مطابق ۱۹۸۲ تک مسلم آبادی ۷۰ ملین تھی جبکہ ۱۹۸۲ میں کل چینی آبادی ۱۰۱۹ ملین نفوس پر مشتمل تھی۔

غیر سرکاری ذرائع کے مطابق چین میں ۲۵ ہزار مساجد ہیں جن میں سے ۱۵ ہزار صرف صوبہ سنکیانگ میں واقع ہیں۔

محمد آصف خان، لاہور

ترجمان القرآن (مارچ ۱۹۹۵) میں جناب خالد سیف اللہ رحمانی نے "امت کی پیوند کاری" (صفحہ ۲۶) میں لکھا ہے: "مشہور مالکی فقیہ ابن عربی....."

انھیں ابن عربی کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ابن العربی تھے۔ ان کا پورا نام ابوبکر محمد بن عبداللہ تھا۔ انھوں نے ۱۱۴۸ میں وفات پائی۔

اسی شمارہ میں جناب پروفیسر عبدالقدیر سلیم نے اپنے مضمون "یورپ میں فلسفہ سائنس کا ارتقا" (صفحہ ۶۵) میں ابن عربی کو ابن العربی لکھ دیا ہے جو ٹھیک نہیں ہے۔

غلام عباس طاہر، وریام والا، جھنگ

ہر ماہ ایک مسلمان ملک کا مفصل تعارف آنا چاہیے جس میں وہاں کی تاریخ، ثقافت، اسلام سے لگاؤ، تحریکیں، موجودہ صورت حال، مالی و مادی و دفاعی وسائل، وہاں کی مشہور عمارات، منفرد خوبیاں، مساجد، اسلامی مراکز اور عظیم شخصیات کے متعلق سب کچھ ہو۔ اس ملک کا مفصل نقشہ بھی دیں۔

حافظ مختیار احمد، شکار پور

بحیثیت مسلم کے پوری دنیائے اسلام کے حالات معلوم کرنا، جبکہ دنیا کو نئے نئے چیلنج امت مسلمہ کو تہ و بالا کرنے کے لیے مغربی دنیا بے چین ہو، فرض سمجھتا ہوں۔ ترجمان پڑھ کر اپنے دل کی آگ بجھا لیتا تھا۔

لیکن کچھ ماہ سے "اسلامی تحریکیں" کے موضوع پر کچھ نظر نہیں آتا اور یوں دل کی آگ مزید بڑھتی جاتی ہے۔ براہ کرم ہمیں عالم اسلام کے حالات سے آگاہ رکھیں۔

حافظ محمد امان اللہ خان ، خوازہ خیلہ سوات

رسالہ کے پیکٹ پر "اشاعت کا ۶۲ واں سال" پڑھ کر انتہائی تعجب ہوا کہ اس قدر قدیم رسالہ اور علوم و معارف کا خزانہ اور ہماری نظروں سے اوجھل رہا۔ بہرحال جو تاثر اس کے بارے میں قائم کیا تھا اسی کے مطابق پایا۔ یعنی اول تا آخر دینی، علمی اور فکری مضامین کا حسین گلدستہ پایا۔

حمید اللہ ، صوابی

رسالے کو عام فہم اور آسان بنائیں۔ ورنہ ہم جیسے دیہاتی لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل ، کراچی

ترجمان القرآن کے مقاصد اور تحریک کی کامیابی کے لیے آپ جس طرح کوشاں ہیں ، میری جانب سے ان کے لیے نیک خواہشات قبول فرمایئے۔

عبد الرحمن فاروق ، کالا باغ

میں ترجمان القرآن کا مستقل قاری ہوں۔ پہلے پہل ترجمان القرآن آتا اور پڑا رہتا تھا۔ لیکن اب یقین کریں کہ بڑی شدت کے ساتھ اس کا انتظار ہوتا ہے اور آتے ہی پہلی فرصت میں ختم کرتا ہوں۔

طیب گلزار ، لاہور

ڈاکٹر صوفیہ جمیلہ کے دورہ پاکستان کے تاثرات "جستجو" ترجمان القرآن فروری ۹۵ میں شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے گذشتہ ماہ رمضان کے تیسرے عشرے میں لندن کی جامع مسجد میں اسلام قبول کر لیا۔ اور بالآخر منزل کو پا لیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے ایمان میں اخلاص اور استقامت عطا فرمائے۔

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی

رُوح افزا

تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو، کیسی ہی محفل ہو، ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔

فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں لازوال۔



رُوحِ پاکستان۔ رُوح افزا
راحتِ جان۔ رُوح افزا

ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ ترجمان القرآن کے بعض اہم مضامین کے ری پرنٹس فراہم کرنے کا آغاز کیا جارہا ہے۔ یہ خوبصورت ٹائیٹل کے بغیر محض لاگت پر سینکڑہ کے حساب سے دستیاب ہیں۔ نقد ادائیگی پر یا وی پی کے ذریعے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ کم سے کم ۱۰۰ کتابچوں کا آرڈر لازمی ہے۔ کوئی ایک مضمون ۲۵ سے کم نہ طلب کیا جائے۔

امید ہے کہ معاشرے کی بہتری اور اس میں تبدیلی لانے کے لیے جو افراد' ادارے اور تنظیمیں سرگرم عمل ہیں وہ اس سہولت سے فائدہ اٹھائیں گی اور بڑی تعداد میں کتابچے حاصل کرکے نہ صرف اپنے حلقہ تعارف و اثر میں بلکہ نئی نئی جگہ پر پھیلائیں گی۔

۱۔ تحریک اسلامی: کارکنوں کے اوصاف	پروفیسر غلام اعظم	مئی ۹۵	۱۳۰ روپے سینکڑہ
۲۔ نئی صلیبی جنگ: دینی مدارس کے دروازوں پر	خرم مراد	اشارات مئی ۹۵	۱۰۰ روپے "
۳۔ توہین رسالت کا مقدمہ	خرم مراد	اشارات مئی ۹۵	۱۰۰ روپے "
۴۔ پاک امریکہ تعلقات کی کہانی	خرم مراد	اشارات اگست ۹۴	۲۰۰ روپے "
۵۔ رب کے در پہ	مسلم سجاد	فروری ۹۵	۵۰ روپے "

[ڈاک خرچ بذمہ خریدار]

منشورات

ترجمان ری پرنٹس سروس

منصورہ' لاہور۔ 54570

فون 8-042/7570124 ۔ فیکس: 042/7832194

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ' لاہور سے شائع کیا۔

REGD. NO. L 5340

PHONES : 7587916
7585590

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

